اقبال
قرآن کی روشنی میں!
قاضی محمد ظریف
ایم اے۔ بی ٹی
کتاب منزل، کشمیری بازار لاہور

ہو
طالعہ
یام
رف
کو ب
ں ب
ضرت
ر
لامت
تے
قاض
وؤں
مور
دہ ا
ں اپ

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ

اِقبال

(قرآنِ حکیم کی روشنی میں)

قاضی محمد ظریف ایم اے، بی۔ ٹی

ایسوسی ایٹ ممبر انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن لنڈن

پبلشرز

کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

بارِ سوم

قیمت چھ روپے

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

"اقبال کا کلام کما حقہ، سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک قرآن کریم نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔ جو کوئی اس زاویۂ نگاہ سے پیامِ اقبال کو دیکھے گا۔ وہ جہاں ایک طرف یہ محسوس کرے گا کہ قرآن کریم انسان کو کن بلندیوں تک پہنچاتا ہے وہاں دوسری طرف اُس پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے گی کہ حضرت علامہ قرآنِ کریم کے بڑے بڑے اہم حقائق اور ادق مسائل کو کس خوبصورتی اور سلاست سے ایک ایک شعر میں حل کر کے رکھ دیتے ہیں"[1] یہ تھے وہ الفاظ جنہوں نے آج سے کئی سال پہلے میرے دل میں اقبال کے قرآنی پہلو کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ شوق ترقی کرتا گیا اور یہ حقیقت سامنے آتی گئی کہ اقبال نے اپنے کلام میں اسلام کی ترجمانی کر کے نوعِ انسان کو انسانیت کے اعلےٰ وارفع مقام تک پہنچانے کی انتہائی کوشش کی ہے۔

برسوں کی جگر سوزی کے بعد اُنہوں نے رازِ حیات معلوم کیا اور پھر اُس کے انفرادی و اجتماعی ہر دو پہلو قوم کے سامنے پیش کئے۔ مسلمانوں کو اُنہوں نے شانِ مومن سے آگاہ کیا۔ اُنہیں فقر و خودی کے راز سمجھائے

[1] یومِ اقبال پر چودھری غلام محمد پرویز کا مضمون

اور مردِ خود آگاہ و خدا مست کی قوتوں سے تعارف کرایا۔ عقل و عشق کی کشمکش اور عقلِ ادب خوردۂ دل کے راز، اور زمان و مکان کے اسرار بیان کیے۔ زندگی اور موت کی حقیقت، مادہ اور روح کی ثنویت فلسفہ مذہب اور سائنس کا تعلق۔ غرضیکہ ہر اہم مسئلہ کو رسول اکرم صلعم کے پیدا کیئے ہوئے انقلاب کی روشنی میں پیش کر کے مسلمانوں کو دعوتِ عمل دی اور مولانا محمد علی مرحوم سے بجا طور پر "اسلامی نشاۃ الثانیہ کے علمبردار" کا نام پایا ؎

اس میں شک نہیں کہ علامہ اقبال بہت بڑے شاعر تھے لیکن ان کی شاعری صرف ان کے اسلامی پیغام کا ایک ذریعہ تھی جو لوگ ان کے کلام میں محض شاعری کو ڈھونڈتے ہیں۔ وہ صرف ظاہر پر نظر رکھتے ہیں اور پنہاں حقیقت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ مثنوی اسرار خودی کی تمہید میں فرماتے ہیں ؎

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست　　بُت پرستی بُت گری مقصود نیست

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے روحِ زمانہ کے مطابق آپ کو پیغام مصطفوی کی تبلیغ و اشاعت کے لیے منتخب فرمایا۔ آپ نے بھی اپنی تمام عمر میں اس فرض کو نہایت خوبی سے سرانجام دیا۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمان پیغمبرِ نبیؐ سے بیگانہ ہو گئے ہیں اور ان میں زندگی کی آخری چنگاری بھی بجھ رہی ہے چنانچہ اس بھولے ہوئے سبق کو دوبارہ یاد کرانے کے لیے محفل میں شمع ہدایت روشن کی اور مردہ قوم کے عروق میں زندگی کی

تڑپ پیدا کرنے کی پوری سعی کی ؎

مسلم از سِرّ نبی بیگانہ شد ۔ باز ایں بیت الحرم بُت خانہ شد
از منات و لات و عُزّیٰ و ہبل ۔ ہر یکے دارد بُتے اندر بغل
شیخ ما از برہمن کافر تر است ۔ زانکہ او را سومنات اندر سر است
بشل ز بزم عجم ترسندہٗ ۔ سینہ اش فارغ ز قلب زندہٗ
نعشش از پیش طبیباں بردہ ام ۔ در حضورِ مصطفٰے آوردہ ام
مردہ بود از آبِ حیواں گفتمش ۔ سِرّے از اسرارِ قرآں گفتمش

محفل از شمع نوا افروختم
قوم را رمزِ حیات آموختم ۔ رموز ۱۹۵

مولینا گرامی نے اسی وجہ سے علامہ اقبال کے متعلق لکھا ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال ۔ پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

علامہ سید سلیمان ندوی نے علامہ اقبال کی ابتدائی زندگی کے دو واقعے بیان کیے ہیں۔ جن کا اثر اُن کے سارے کلام اور پیام میں نمایاں ہے۔ اُن کی اہمیت کے پیشِ نظر انہی کے الفاظ میں یہاں درج کیے جاتے ہیں ؛

"سفرِ کابل کی واپسی میں قندھار کا ریگستانی میدان طے ہو چکا تھا اور سندھ و بلوچستان کے پہاڑوں پر ہماری موٹریں دوڑ رہی تھیں شام کا وقت تھا۔ ہم دونوں ایک ہی موٹر میں بیٹھے تھے۔ روحانیات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اربابِ دل کا تذکرہ تھا کہ موصوف نے بڑے

تاثر کے ساتھ اپنی زندگی کے دو واقعے بیان کیے۔ میرے خیال میں یہ دونوں واقعے اُن کی زندگی کے سارے کارناموں کی اصل بنیاد تھے۔

"فرمایا۔ جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اُٹھ کر روزانہ قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ والدِ مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھ کو دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو وہ میرے پاس سے گزرے تو مسکرا کر فرمایا۔ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ میں نے دو چار دفعہ بتانے کا تقاضا کیا تو فرمایا جب امتحان دے لوگے تب۔ جب امتحان دے چکا اور لاہور سے گھر آیا تو فرمایا جب پاس ہو جاؤ گے۔ جب پاس ہو گیا اور پوچھا تو فرمایا بتاؤں گا۔ ایک دن صبح کو حسبِ دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آ گئے اور فرمایا، بیٹا۔ کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم ہی پر اُترا ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ خود تم سے ہمکلام ہے۔ ڈاکٹر اقبال کہتے تھے کہ اُن کا یہ فقرہ میرے دل میں اُتر گیا اور اُس کی لذت دل میں اب تک محسوس کرتا ہوں۔ یہ تھا وہ تخم جو اقبال کے دل میں بویا گیا اور جس کی تناور شاخیں پہنائے عالم میں اُن کے موزوں نالوں کی شکل میں پھیلی ہیں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ باپ نے ایک دن بیٹے سے کہا کہ میں نے تمہارے پڑھانے میں جو محنت کی ہے۔ تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ لائق بیٹے نے بڑے شوق سے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ جواب ملا

کسی موقعہ پر بتاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دفعہ کہا کہ میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا۔ بات ختم ہو گئی۔ ڈاکٹر اقبال کہتے تھے کہ اس کے بعد میں نے لاہور میں کام شروع کیا۔ ساتھ ہی میری شاعری کا چرچا پھیلا اور نوجوانوں نے اس کو اسلام کا ترانہ بنایا لوگوں نے نظموں کو ذوق و شوق سے پڑھا اور سُنا اور سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا۔ ان ہی دنوں میں میرے والد مرض الموت میں بیمار ہوئے۔ میں اُن کو دیکھنے کے لیے لاہور سے آیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ والد بزرگوار، آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں؟ باپ نے بستر مرگ پر شہادت دی کہ "جان من! تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا"۔

کون انکار کر سکتا ہے کہ اقبال نے ساری عمر جو پیام ہم کو سُنایا وہ ان ہی دونوں متنوں کی شرح تھی۔[1]

آپ نے قرآن کریم کو اپنا نصب العین بنایا اور اس کی روشنی میں اپنے نظریے بھی تبدیل کیے۔ جن کی وجہ سے بعض اوقات اُن پر تضاد کا اعتراض کیا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ اُن کے فکر و نظر کا ارتقا تھا۔ جو قرآن کریم کے مطالعہ اور سمجھ سے اُن میں پیدا ہو رہا تھا۔ قرآن کریم کو سمجھنے اور اہم مسائل پر صحیح اسلامی نظریہ معلوم کرنے کے لیے جو اضطراب اور تجسس ہمیشہ انھیں رہا۔ اس کا کچھ اندازہ ان کے بعض خطوط سے ہوتا ہے۔ جو مکاتیب اقبال میں شائع ہو چکے ہیں۔ سر عبدالقادر نے

---

[1] جوہر اقبال صفحہ ۱۹-۲۰

اپنے ایک مضمون میں اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ "اقبال ایک ایسا عبقری تھا جس کا آغاز شعر سے ہوا۔ لیکن جس کی انتہا فکر پر ہوئی۔ اس کو اپنی دماغی مسافت میں وہ تمام مدارج پیش آئے۔ جو ایسے انسان کو پیش آتے ہیں جس کی کارگہِ عمل خود اس کا دماغ ہوتا ہے اور بالآخر وہ اپنی ذہنی فتح مندیوں کی ایک ایسی اقلیم چھوڑ جاتا ہے۔ جو تلوار کی کشور کشائیوں سے کہیں بڑھ کر دیرپا ہوتی ہے۔

" اقبال کے نظریات کی ترتیب میں وقت کی بعض تصوراتی تحریکوں کے عملی نقشوں کا عظیم حصّہ ہے۔ پہلے وہ ان تحریکوں میں سے بعض کے قبول عام سے متاثر ہوا اور بطور شاعر ان کے حق میں فضا پیدا کی۔ لیکن جب وہ عمر کے ساتھ جذبات کی دیواریں پھاند کر علم و نظر کے حقیقی سکون میں آگیا تو اس نے ایک مبصر کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہر عبقری اپنے عصری آثار چڑھاؤ سے متاثر ہوتا اور وقت کے ساتھ اپنے مطالعہ و مشاہدہ اور تجربہ و تجزیہ سے ایک ایسی دولت سمیٹ لیتا ہے۔ جو اس کے ذہنی نشو و ارتقا کا سبب بن کر ایک اجتماعی فکر اور بے لوث تخیل کی صورت اختیار کرتی ہے۔ لیکن اقبال اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس نے ایک ایسی قوم کی رفتار معین کرنی چاہی جس کا طنطنۂ اقتدار پیوندِ زمین ہو چکا تھا اور جس کی فاتحیت کے نقش و نگار یا تو تاریخ کے صفحوں میں چند بے ربط افسانوں کا نشان ہو کر رہ گئے تھے یا اس کے کچھ آثار سنگ و خشت کی ان عمارتوں میں منعکس دکھائی دیتے ہیں جنہیں

عرف عام میں کسی قوم کا تہذیبی ورثہ کہا جاتا ہے۔[1]
اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فکر کی پختگی کے ساتھ ان کا منتہائے نظر یہ ہو گیا کہ اللہ کی حکومت کو ساری دنیا پر پھیلایا جائے۔ بنی نوع انسان کی خاطر ان کا جگر خون ہوتا اور ان کی آنکھوں سے پانی بن کر نکلتا ہے

بہر انسان چشم من شبہا گریست | تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
از درونِ کارگاہِ ممکنات | برکشیدم سرِ تقویم حیات

اسرار ۱۰

اپنی تب و تاب سے تمام مسلمانوں کو حصہ دینا چاہتے تھے اور اپنے بادہ سے یک دو جام ہر کسی کو پیش کرتے تھے ؎

از تب و تابم نصیب خود بگیر | بعد ازیں نا ید چو من مردِ فقیر
گوہر دریائے قرآں سفتہ ام | شرحِ رمزِ صِبغَۃَ اللہ گفتہ ام
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام | تا درخشی مثلِ تیغ بے نیام

مسافر ۴۳

لیکن اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتے رہے۔ اپنے غم پنہاں کی فریاد حضور رسالت مآب میں کرتے تھے ؎

غم پنہاں کہ بے گفتن عیان است | چو آید بر زبان یک داستان است
رہِ پر پیچ و راہی خستہ و زار | چراغش مردہ و شب درمیان است

ارمغان حجاز ۴۴

وہ دیکھتے تھے کہ بحر میں موج بھی موج کے ہم پہلو چلتی ہے اور شمع کا

[1] چٹان لاہور کا اقبال نمبر ۹

سوز تنہا بھی کام نہیں دیتا لیکن وہ لالۂ صحرا کی طرح محفلِ زندگی میں تنہا قوم کو بلا بلا کر قرآن کریم کی تعلیم سے آشنا کرتے رہے ہے

منکہ بہرِ دیگراں سوزم چو شمع | بزم خود را گریہ آموزم چو شمع
دل بدوش و دیدہ بر فردا ستم | درمیانِ انجمن تنہا ستم
شمع را سوزِ عیاں آموختم | خود نہاں از چشمِ عالم سوختم

حتیٰ کہ ہے

شعلہ ہا آخر ز ہر مویم دمید | از رگِ اندیشہ ام آتش چکید
عندلیبم از شرر ہا دانہ چید | نغمۂ آتش مزاجے آفرید

لیکن شمع کے لیے اکیلے جلنا کتنا مشکل ہے ہے

سینۂ عصرِ من از دل خالی است | می تپد مجنوں کہ محمل خالی است
شمع را تنہا تپیدن سہل نیست | آہ یک پروانۂ من اہل نیست
موج در بحر است ہم پہلوے موج | ہست با ہمدم تپیدن خوے موج
من مثالِ لالۂ صحرا ستم | درمیانِ محفلے تنہا ستم
خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے | از رموزِ فطرتِ من محرمے
ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ | از خیالِ این و آں بیگانۂ

تا بجان او سپارم ہوے خویش
باز بینم در دلِ او روے خویش — اسرار ۸۹-۹۰

ان حالات میں علامہ اقبال نے مسلمانوں میں یہ خوبی پیدا کرنے کی کوشش کی کہ تمام مسائل کا حل قرآن کریم کی روشنی میں

کیا جائے اور اسلام کو اس کی اصلی صورت میں دیکھا جائے۔ اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل میں انھوں نے خود لکھا ہے کہ "اسلام پر موبدانہ رنگ چڑھ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے بعض غیر مسلم اور یورپین مصنف غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان خطبات سے میرا مدعا یہ ہے کہ اسلام کے چہرے سے اُن موبدانہ غلافوں کو ہٹا کر اس کی اصل روح کو بے نقاب کروں۔"[1]

زندگی کے آخری دنوں میں علامہ مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ زندگی کی بقیہ گھڑیاں قرآن کریم پر عہد حاضرہ کے افکار کی روشنی میں کتاب لکھنے کے لیے وقف کر دیں اور اپنی بہترین پیشکش مسلمانانِ عالم کو کریں۔ سید راس مسعود کو کہا "چراغِ سحر ہوں۔ بجھا چاہتا ہوں۔ تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم کے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں جو تھوڑی سی ہمت و طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے۔ اُسے اسی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ (قیامت کے دن) آپ کے جد امجد (حضور نبی کریمؐ) کی زیارت مجھے اس اطمینانِ خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ جس عظیم الشان دین کی خبر حضورؐ نے ہم تک پہنچائی۔ میں بھی اُس کی کوئی خدمت بجا لا سکا۔"[2]

لیکن افسوس کہ عالمِ اسلام اِس نعمت سے محروم رہا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبال سے عقیدت کا کوئی طریق اس سے بہتر نہیں کہ اُن کے اس کلام کو جو وہ ہمارے درمیان چھوڑ گئے ہیں۔ قرآن کریم کی لازوال روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کی سعی کی جائے۔ پیش نظر کتاب اسی خواہش کا اظہار ہے۔

---

[1] خطبات صفحہ ۵[illegible] [2] اقبال نامہ صفحہ ۲۶۱

اور میرے اس مطالعہ و فکر کا ایک دھندلا سا خاکہ ہے۔ جو اس سلسلہ میں مجھ سے ہو سکا۔ یہ سعی کسی طرح مکمل نہیں کیونکہ یہ وہ عنوان ہے۔ جس پر کتابِ ہذا کے ہر باب کے متعلق کلامِ اقبال سے الگ الگ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ میرا مدعا صرف اس راہ پر چلنے والوں کو یہ حقیقت نمایاں کرنے کا ہے کہ اقبال کا کلام قرآن کا بیان ہے اور اس میں بہت کچھ تحقیق کی ضرورت ہے ممکن ہے کہ علامہ مرحوم کے پیغام اور فلسفہ کو قرآن کریم کی روشنی میں دیکھنے کا شوق اس کوشش ناتمام سے تیز تر ہو اور وقت کی اہم ضرورت کسی صاحبِ قلم کے ہاتھوں پوری ہو سکے۔

علامہ اقبال کے افکار کے متعلق کچھ لکھنے کے لیے بہت وسیع مطالعہ درکار ہے جس میں فلسفہ اور الٰہیات اہم جزو ہیں مشرقی علوم کے ساتھ جب تک مغربی فلسفہ اور مغربی تمدن کا بھی مطالعہ نہ کیا جائے۔ قلم اُٹھانا مشکل ہے راہ پرپیچ اور سفر دشوار ہے۔ لیکن علامہ اقبال کے خطبات، تقاریر، بیانات اور مکاتیب بہت حد تک مشکل مسائل کے حل میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ اُن کے ذریعہ بعض دفعہ شاعرِ مشرق کا فلسفہ عیاں ہو کر نظر کے سامنے آجاتا ہے اور بعض دفعہ اُن کی ذات کے وہ پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ جن کا اُن کے خیالات کی ترتیب میں اہم حصہ ہے۔ ان میں حرف اقبال (مؤلفہ لطیف احمد شروانی) اقبال نامہ یعنی مجموعہ مکاتیب اقبال (مرتبہ شیخ عطا اللہ ایم اے) اقبال کے خطوط عطیہ بیگم کے نام (انگریزی) اور ملفوظاتِ اقبال (محمود نظامی) مفید مصالحہ ہیں۔

علامہ مرحوم کی انگریزی کتاب The Development of Metaphysics in Persia
مشرقی مابعد الطبعی نظام فکر کو سمجھنے میں بہت امداد دیتی ہے ۔
اس کے ترجمہ موسومہ "فلسفہ عجم" (از میر حسن الدین) سے بھی حوالے پیش کئے گئے ہیں ۔
آپ کے انگریزی خطبات Reconstruction of Religious Thought in Islam
(الٰہیات اسلامیہ کی جدید تشکیل) علامہ اقبال کے اُن افکار کا آئینہ ہیں جن کے متعلق آپ نے پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی کو فرمایا کہ "اگر یہ کتاب مامون الرشید کے عہد میں شائع ہوتی تو بلاشبہ تمام دنیائے اسلام میں ایک ہیجان اور انسانی ذہنیت میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا[1]
یہی وہ خطبات ہیں جن کے متعلق امریکہ کے ڈاکٹر سپرینگ لنگ[2] نے کہا کہ سر محمد اقبال کا فلسفہ نہایت بیش قیمت جواہرات کی کان ہے ...
مشرق کے فلاسفہ ... میں سب سے قابل قدر شخصیت ڈاکٹر اقبال کی ہے موجودہ زمانہ کے بہترین مسلمان اور ہر پہلو سے مغرب کے بڑے سے بڑے فلسفی کے برابر ہیں ۔ اُن کے خطبات مدارس سے بڑھ کر اور کوئی تصنیف بھی دنیا کو اُن کے اصل مقام سے روشناس نہیں کر سکتی ۔ ان سے

---

[1] "تعلیمات اقبال" ——— پروفیسر سلیم چشتی
[2] Dr. Sprengling

فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اور مناسب مقامات پر 'خطبات' کے نام سے حوالے درج کیئے گئے ہیں۔

قرآن کریم میں بصیرت حاصل کرنے کے لیے مختلف تفسیروں کا مطالعہ کیا گیا۔ اُن کے علاوہ "معارف القرآن" چودھری غلام احمد پرویز و سیرۃ النبی پر مناسب لٹریچر مفید ثابت ہوا۔ سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی تصنیف رحمۃ للعالمین سے بہت مدد ملی۔

اسی طرح علامہ اقبال کے فلسفہ و کلام پر مختلف اوقات میں جو کتب و لٹریچر شائع ہوا۔ کارآمد ہے۔ اُن میں تعلیماتِ اقبال (پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی)، رموزِ اقبال (ڈاکٹر میر ولی الدین) اور روحِ اقبال (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) قابلِ ذکر ہیں۔

مثنوی مولانا روم کا مطالعہ نہایت کارآمد ہے۔ اس کے لیے مطبع نامی کانپور کی شرح، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی انگریزی کتاب Metaphysics of Rumi، ڈاکٹر نکلسن کی انگریزی کتاب Rumi — Poet and Mystic اور میر ولی اللہ کی کتاب روحِ [illegible] جلد اول و دوم کا مطالعہ مفید ہے۔

مغربی فلسفہ کے سمجھنے کے لیے مختلف کتب کا مطالعہ کیا گیا۔ ان میں سے عام فہم کتاب The Story of Philosophy — Will Durant ہے۔ چند دیگر کتب کے حوالے ساتھ ہی درج کیے [illegible]

گئے ہیں۔

ایک خاص امر جس کی طرف توجہ ضروری ہے۔ یہ ہے کہ بعض اوقات اسلام کا موازنہ دیگر مذاہب سے کرنے کی ضرورت ہوئی اور اس سلسلہ میں حضرت عیسیٰؑ و حضرت موسیٰؑ کی تعلیمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر ان انبیاء کی جن تعلیمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن سے مراد وہ تعلیم ہے جو اُن کے پیرو آج کل کے زمانہ میں اُن کی طرف منسوب کرتے ہیں یا موجودہ زمانہ میں اُن کے صحیفوں میں پائی جاتی ہے۔ ورنہ اُن کی حقیقی تعلیم تو وہی ہے جس کی تکمیل حضور خاتم المرسلین کے ذریعہ ہوئی۔

اُن تمام لغزشوں اور غلطیوں کے باوجود جو اس قسم کے کام میں انسان سے ہونی لازم ہیں۔ مجھے یہ توقع ہے کہ یہ سعی قوم کو اس طرف راغب کر سکے گی کہ وہ شاعرِ اسلام کے اصل معانی کو پہچانیں۔ اُن سے حقیقی شراب پئیں اور خم و سبو کے نظارہ میں مست نہ رہیں۔ اُن سے شکوہ خسروی و تختِ کسریٰ حاصل کریں اور حدیث دلبری و رنگ شاعری کے تمنائی نہ رہیں۔ اُن کی بیتابیٔ جان اور خونِ دل کی رنگینی سے اثر لیں اور اُن کے پیام کے پنہاں معانی کو پہچانیں تاکہ اُن کی رُوح کو یہ شکایت نہ ہو کہ ؎

آشنائے من زمن بیگانہ رفت	از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم	تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد زمن	رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن

کم نظر بے تابیٔ جانم ندید　　آشکارم دید و پنہانم ندید
حق رموزِ ملک و دیں برمن کشود　　نقش غیر از پردۂ چشمم ربود

برگ گل رنگین زمضمونِ من است
مصرعِ من قطرۂ خونِ من است

پیام مشرق ۳

لاہور - ۱۲ر دسمبر ۱۹۵۰ء

قاضی محمد ظریف

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ضابطۂ حیات

حفظِ قرآنِ عظیم آئینِ تست — حرفِ حق را فاش گفتن دینِ تست
مردِ حق از کس نگیرد رنگ و بُو — مردِ حق از حق پذیرد رنگ و بُو
جز حرم منزل ندارد کارواں — غیرِ حق در دل ندارد کارواں

جاوید نامہ ۸۶

ہر قوم کی حیات و بقا کے لیے ایسا لائحہ عمل ضروری ہوتا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنی زندگی کو فروغ دے سکے اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو قائم رکھ سکے۔ ہر متمدن قوم اپنے آئین و قانون کی پیروی کو لازمی خیال کرتی ہے۔ جو قوم اپنا دستور نہیں رکھتی۔ وہ کبھی سرفراز و سربلند نہیں ہو سکتی۔

مسلمانوں کے لیے ضابطۂ حیات اور آئین قرآن حکیم ہے۔ جو زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ یہ ایسا پیام ہے۔ جس میں حیاتِ انسانی کا مکمل نظام موجود ہے۔ اس کی حکمت لا یزال اور قایم ہے۔ اسے ہمیشہ کے لیے انسانی ہدایت کا نصاب قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں کارگہِ حیات کے ہر شعبہ ہر ماحول اور زندگی کے ہر گوشہ کے متعلق صاف اور سادہ

قوانین موجود ہیں۔ جو فطرت کے عین مطابق ہوتے ہوئے انسان کی کامیابی وکامرانی کے اسباب مہیا کرتے اور اس کو اوجِ ثریا تک پہنچاتے ہیں انسانی ہدایت کا یہ ابدی لفاب ایک نور ہے جو انسانوں کو روشنی میں لاتا ہے:۔

جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ	تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کتاب آچکی ہے۔
هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۹	وہی خدائے مہربان ہے جو اپنے بندے (محمد) پر (قرآن کی) کھلی کھلی آیتیں نازل فرماتا ہے تاکہ تم کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان کی) روشنی میں لائے اور بے شک اللہ تم (لوگوں کے حال) پر بڑی شفقت رکھنے اور مہربان ہے۔

گل کو گلدستہ اور غوغا کو نغمہ میں تبدیل کرنے کے لیے آئین کی ضرورت پڑتی ہے۔ علامہ اقبال نے ضرورتِ آئین و آئینِ قرآنی کی پیروی پر زور دیا ہے:۔

ملتے را رفت چوں آئین ز دست — مثل خاک اجزائے او از ہم شکست
ہستیِ مسلم ز آئین است و بس — باطنِ دینِ نبی ایں است و بس
برگِ گل شد چوں ز آئین بستہ شد — گل ز آئین بستہ شد گلدستہ شد
نغمہ از ضبطِ صدا پیدا ستے — ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستے

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟ — زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست؟
آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرار تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

رموز ۱۴۰

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن — رموز ۱۴۲

اللہ تعالےٰ نے مسلمان کو قرآنی نظام عطا کیا تاکہ وہ اس کے احکام کی پیروی کر کے صحیح معنوں میں خلافت ارضی کا مستحق قرار پائے۔ علامہ اقبال کے نزدیک اس آئین کی سختی کے ساتھ پابندی ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی قوت قرآنی نظام کے نفاذ کی کسی جز و یا مستحب کی ادائیگی میں بے سبب مزاحم ہو تو مسلمانوں کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ آئینِ شریعت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں ورنہ اُن کا بقا معرضِ خطر میں پڑ جائے گا۔

ملت از آئینِ حق گیرد نظام — از نظامِ محکمے خیزد دوام
اے کہ باشی حکمتِ دیں را امین — با تو گویم نکتۂ شرعِ مبین
چوں کسے گردد مزاحم بے سبب — با مسلماں در ادائے مستحب
مستحب را فرض گردانیدہ اند — زندگی را عین قدرت دیدہ اند
شارحِ آئینِ شناسِ خوب و زشت — بہرِ تو ایں نسخۂ قدرت نوشت
از عمل آہن عصب می سازدت — جائے خوفے در جہاں نندازدت
تا شعارِ مصطفےٰ از دست رفت — قوم را رمزِ بقا از دست رفت

رموز ۱۲۶

اس نظام کے لیے ملوکیت اور قومیت پرستی بدترین لعنت ہیں۔ ذات پات کی تقسیم اور غلامی کا تصور ناقابلِ برداشت ہیں۔ اس کی رُو سے معاشی نظام میں دولت کی گردش کا ایسا طریق رکھا گیا ہے کہ وہ کسی ایک طبقہ میں قیام نہیں کر سکتی۔ قرآنی قوانین کی رُو سے کسی آدمی کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ کیونکہ آدمی کا آدمی ہونا ہی اُس کے لیے بڑی وجہ احترام ہے۔ ہر قسم کی تفریق جو جسدِ انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والی ہو۔ قرآن کے نزدیک ممنوع ہے۔ نسل، وطن، رنگ یا زبان کا کوئی فرق قرآن کے عالمگیر تصور میں غیر فطری رکاوٹ کا موجب نہیں ہو سکتا ہے

داستان کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب
چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو — لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا
جز بقرآں ضیغمی روباہی است — فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

جاوید نامہ ۸۹

رہزناں از حفظِ او رہبر شدند — از کتابے صاحبِ دفتر شدند

رموز ۱۶۱

قرآن کریم کا دعوےٰ ہے کہ راہ گم کردہ انسانوں کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۲/۱۰ — اُن کے دلوں میں دکھ کا مرض لگا ہے

اور قرآن اُس بیماری کے لیے شفا اور تمام نوع انسانی کے لیے سرچشمہ ہدایت و رحمت ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ﳔ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۞ ۱۰/۵۷	اے لوگو تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے ایک ایسی چیز آگئی جو موعظت ہے دل کی تمام بیماریوں کے لیے شفا ہے اور ہدایت و رحمت ہے اُن لوگوں کے لیے جو (اس پر) یقین رکھتے ہیں۔

ویسے تو جس وقت سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رشد و ہدایت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے برابر یہ سلسلہ جاری رکھا اور حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے ہر زمانہ میں مختلف قوموں کی طرف اپنا پیغام بھیجا۔ لیکن قرآن کریم میں اُن تمام ازلی حقائق کو یک جا کر کے قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا تاکہ جب تک انسان اس خطۂ ارضی پر رہے۔ اس کے لیے رشد و ہدایت کا ایک مکمل نصاب موجود ہو۔

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۵/۴۸	اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق اتاری جو کتابیں اس سے پہلے ہیں۔ اُن کی تصدیق کرتی ہے اور محافظ ہے۔ پس جو کچھ خدا نے تم پر اُتارا ہے اُس کے مطابق ان لوگوں میں حکم دو۔

قرآن کریم کی اس عظمت کو بیان کیا ہے ؎

نقش قرآن تا دریں عالم نشست | نقش ہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است | ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

جاوید نامہ ۹۰

ان ہی ابدی حقائق کی وجہ سے قرآن مجید نے دعویٰ کیا کہ اللہ کی باتیں کوئی نہیں بدل سکتا۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۚ ۲/۲	یہ وہ کتاب ہے۔ جس میں کچھ بھی شک نہیں۔
لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۱۰/۶۴	خدا کی باتوں میں (ذرہ بھی) تبدیلی نہیں ہوتی۔

علامہ اقبال نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے ؎

حرف او را ریب نے تبدیل نے | آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

رموز ۱۴۰

یہی حقائق ہیں جن کی بنا پر علامہ اقبال نے مغربی تقلید کو چھوڑ کر قرآن کریم کی تعلیم پر عمل کرنے کی تاکید کی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ملت بیضا کے نوجوان کے متعلق مرحوم نے فرمایا کہ "موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولانگاہ بنا ہوا ہے اور یہی حلقے روش الا شہاد کہتا

ہوں کہ اپنی قومی روایات کے پیرایہ سے عاری ہو کر اور مغربی لٹریچر کے نشہ میں سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے۔ بلا خوف تردید میرا یہ دعوٰی ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلےٰ اور قابلِ تقلید مثالیں اپنے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے۔ لیکن باایں ہمہ ہمارے نوجوان کو جو اپنی قوم کی سوانحعمری سے بالکل نابلد ہے۔ مغربی تاریخ کے مشاہیر سے استحساناً و استشہاداً رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عقلی دادرا کی لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف، تجربہ آج ہم سے کرا رہا ہے۔ نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت احدے اپنا ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اُس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں"۔

تھوڑا آگے چل کر ارشاد کیا ہے کہ "مجھے رہ رہ کر یہ رنج دہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم جو اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے روحانی طور پر بمنزلہ ایک بے جان لاش کے ہے اور اگر موجودہ صورت حالات اور بیس سال تک قائم رہی تو وہ اسلامی رُوح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم برداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے۔ ہماری جماعت

کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔ وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز کلامِ مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیئے وہ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی ماہیت و نوعیت سے زیادہ باخبر تھے۔"

چنانچہ اسی خیال کو نظم کیا ہے ؎

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ　　مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ

گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ　　من بجز عبرت نگیرم از فرنگ

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو

دامنِ قرآن بگیر آزاد شو　جاوید نامہ ۷۹

آخری شعر میں رسول اکرمؐ کے متعلق قرآن مجید کے اس ارشاد کی تفسیر کی ہے:۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ ۷/۱۵۷	یہ نبی اُن سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ طوق کاٹتا ہے جو اُن کے گلے میں پڑے ہوئے ہیں۔

علامہ نے مسلم لیگ کے خطبہ میں فرمایا کہ "میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام اور اس کی شریعت، اس کی سیاست مدن اس کی ثقافت اس کی تاریخ اور اس کی ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس روحِ اسلامی کے ساتھ مستقل وابستگی نے مجھے ایک ایسی فراست عطا کر دی ہے جس کی روشنی میں اس عظیم الشان اہمیت کا اندازہ کر سکتا ہوں جو اسلام کو ایک عالمگیر حقیقت ثانیہ کی حیثیت سے حاصل ہے۔"

جو لوگ کوشش کریں اُن کے لیے قوانین الٰہیہ کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ کیونکہ قوانینِ فطرت انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ہمیشہ ایک طرح سے کارفرما رہتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے خود فرمایا کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۴/۱۷﴾

اور حقیقت یہ ہے کہ نصیحت حاصل کرنے کے لیے ہم نے قرآن کو (بہت ہی) آسان کر دیا ہے۔ تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

قرآن کریم سے نصیحت حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم قرآن کے مطالب کو سمجھیں اور حقیقت سے روشناس ہوں۔ قرآن کریم کی ایک بڑی فضیلت جو علامہ اقبال نے بیان کی ہے یہ ہے کہ واقعات کا اسلوب بیان ایسا ہوتا ہے جن کے اندر ابدی فلسفیانہ اور اخلاقی اصول پنہاں ہوتے ہیں جو زمانہ کی روح کے ساتھ ہر وقت مطابقت رکھتے ہیں۔ انہیں افسوس اس بات کا تھا کہ اسلام کا مطالعہ کرنے والے مسلم یا غیر مسلم حضرات نے اس ضروری پہلو کی طرف بہت کم توجہ دی۔ ہمارے مفسرین یہ کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کریم کے بیان کردہ واقعات کا شانِ نزول پیش کیا جائے اور اس طرح وہ اُن واقعات کو خاص حالات و اشخاص سے وابستہ کر کے اُن کے معانی کو محدود کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن حکیم اکثر واقعات کے بیان میں اشخاص یا مقامات کے نام درج کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا [۱]

اقبال اس نظریہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے مسلک سے اتفاق رکھتے

[۱] خطبات صفحہ ۹۲

ہیں ۔شاہ ولی اللہ نے اس امر کے متعلق یوں تحریر فرمایا ہے" تمام واقعات میں اسباب نزول ضروری نہیں البتہ بعض آیات کے متعلق جن میں کسی خاص ایسے واقعے کی طرف اشارہ ہو جو رسول اللہ کے زمانہ میں یا آپ سے پیشتر ہوا۔اُس واقعہ کی تفصیل دی جائے ۔ہمارے لیے لازم یہ ہے کہ علم تفسیر کو اس طرح ترقی دیں کہ خاص خاص واقعات کے بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو" اُن کے مسلک کے مطابق سورۂ مدثر میں آیات نمبر۸ سے ۲۵ تک کے بیان میں حضورؐ کے زمانہ کے عنکر ولید بن مغیرہ سے تعلق پیدا کر کے کام ختم کر دینا کافی نہیں [1] بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اِن حقائق کو جو دراصل سرمایہ پرست ذہنیت کا مکمل تجزیہ نفسی ہے ہر زمانہ پر چسپاں کیا جائے اور اُن کا عام اطلاق کر کے اصل معانی کو دیکھا جائے۔

---

[1] ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا۔آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ نے یہ آیتیں پڑھیں ۔اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ؏ ۱۶/۹

ترجمہ: تحقیق اللہ تعالےٰ انصاف کرنے اور احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی کے کاموں ناشائستہ حرکتوں اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے منع فرماتا ہے اور تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم اِن باتوں کا خیال رکھو۔

ولید نے کہا پھر پڑھنا۔آپ نے دوبارہ پڑھا تو قرآن کریم کے الفاظ میں اُس نے تیوری چڑھائی منہ بنایا پھر پیٹھ پھیر کر چلتا بنا اور تکبر کیا اور کہنے لگا کہ یہ تو جادو ہے [illegible]

بے سمجھے قرآن کریم کا مطالعہ حقیقی اسلام کی روح سے شناسا کرانے میں کسی طرح ممد نہیں ہو سکتا اور جو استعداد قرآن حکیم مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے وہ مفقود رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے نماز کے متعلق بھی تاکید کی ہے کہ مدہوشی کی حالت میں نہ پڑھو۔ بلکہ اُس وقت پڑھو جب تم اپنی زبان سے نکلنے والے الفاظ کا مطلب سمجھنے کے قابل ہو جاؤ۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ۴/۴۳	مسلمانو! جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ جو کچھ (مُنہ) سے کہتے ہو اُس کو سمجھنے لگو۔

اور قرآن کریم کے متعلق تو بار بار فرمایا کہ اس کے مطالعہ سے تم عقل و نصیحت حاصل کرو۔ قرآن کریم سے عقل سیکھنے اور نصیحت حاصل کرنے والی قوم کا نقشہ دنیا کے سامنے ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے اونٹ چرانے والے قیصر و کسریٰ کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے اور کفر و الحاد کی طاقتوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا ؎

حق ترا برّاں تر از شمشیر کرد　　ساربان را راکبِ تقدیر کرد

پس چہ باید کرد ۵۳

اُس زندگی کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قرآن کریم کے اصل معانی کو پہچاننے کے لیے وہ نظر پیدا کریں جو عجائبے اختلاط کے زمانہ کے جملہ تاثرات سے پاک ہو۔ مثال کے طور پر

ایک اثر جو علامہ مرحوم نے محسوس کیا یہ ہے :-

" ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں - اُن کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں - ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں - میں چاہتا ہوں کہ مثنوی (اسرار و رموز) میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کردوں - جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم کے منہ سے ہوئی " لہ چنانچہ ان کی یہ خواہش ان کے دل کی گہرائیوں سے جذبات کے اتھاہ سمندر کو لیے ہوئے رحمۃ للعالمین کے حضور میں اس التجا کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است — در بحرفم غیر قرآں مضمر است

اے فروغت صبح اعصار و دہور — چشم تو بینندۂ مافی الصدور

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

خشک گرداں بادہ در انگورِ من — زہر ریز اندر مے کافورِ من

روز محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام — با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است — یک دعایت مزدِ گفتارم بس است

عرض کن پیشِ خدائے عز و جل — عشق من گردد ہم آغوشِ عمل

در عمل پایندہ تر گرداں مرا

آبِ نیسانم گہر گرداں مرا — رموز ۱۹۶

مندرجہ بالا بحث سے یہ امر واضح ہو گیا کہ قرآن کریم کی یہ گہر حکمت، ہماری

لہ علامہ اقبال کا خط منشی سراج الدین کے نام - اقبال نامہ صفحہ ۴۷

عملی زندگی کے لیے مشعلِ راہ ہے اور مسلمانوں کا یہ ضابطۂ حیات قانون مکافاتِ عمل اور اُس کے اٹل نتائج کو بنی نوع انسان کے سامنے پیش کرتا ہے جو لوگ اس قانون کی اتباع کرتے ہیں اُن کے لیے نجات ہے اور جو اس یاددہانی کی طرف توجہ نہیں کرتے وہ قانونِ خداوندی کی ہمہ گیری سے بچ نہیں سکتے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹/۷۳﴾	بلاشبہ یہ تو ایک (فراموش کردہ حقیقت کی) یاددہانی ہے۔ سو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرے۔

لیکن اس کے بالکل برعکس موجودہ زمانہ کے ملّا اور صوفی نے قرآن کو صرف مسجد و خانقاہ میں پڑھنے کے لیے مخصوص کر دیا ہے اور زیادہ سے زیادہ اس کی آیات سے یہ کام لیا جاتا ہے کہ نزع کی تکلیف سے بچ کر آسانی کے ساتھ موت سے ہمکنار ہو سکیں ؎

یہ بندۂ صوفی و ملّا اسیری ۔۔۔ حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست ۔۔۔ کہ از یٰسینِ او آساں بمیری
(ارمغانِ حجاز)

کیا مسلمان آئینِ خداوندی کی اصل روح سے آشنا ہو کر اس حقیقت کو تسلیم کر یں گے کہ ذکرِ نیم شبی اور مراقبے تب ہی مفید ہیں جب وہ دل و نگاہ کو مسلمان کرنے میں ممد و معاون ہوں ؎

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور ۔۔۔ تیری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل ۔۔۔ دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں
(ضربِ کلیم)

اَلحُکمُ لِلّٰہِ

تقاریر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند — ضرب کلیم ۶۲

دنیا میں آج تک جتنے مذاہب اللہ تعالےٰ کی طرف سے انسان کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے ۔ اُن کا مدعا یہی تھا کہ انسان کو خالق مطلق کے وجود حقیقی سے روشناس کرائیں اور انسان کو اللہ کے سوا ہر قسم کی غلامی سے نجات دلائیں تمام ادیانِ فطرت کی طرح قرآن کریم نے بھی توحید پر بہت زور دیا ہے ارشاد ہوتا ہے ۔۔

وَ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۲/۱۶۳	اور اللہ تمہارا ایک ہی معبود ہے
اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَط ۲۷/۸۶	اللہ تعالےٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ۔
وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَقف ۲۸/۸۸	اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو ۔ اُس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ۔

دلائل بھی پیش کئے ہیں :۔

لَوْ کَانَ فِیْھِمَآ اٰلِھَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا ۲۱/۲۲	اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان دونوں کبھی کے برباد ہو گئے ہوتے
وَمَا کَانَ مَعَہٗ مِنْ اِلٰـہٍ	اُس کے ساتھ اور کوئی خدا نہیں اگر ایسا ہے

اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ ۲۳/۹۱	توہر ایک خدا اپنی مخلوقات کو (الگ) لیئے پھرتا اور آپس میں لڑتے اور آخرکار ایک دوسرے پر غالب آجاتا

شرک کی مذمت میں قرآن کریم کے واضح الفاظ موجود ہیں۔ شرک کو ناقابلِ معافی گناہ، ظلم عظیم، فساد، اور دُور کی گمراہی، وغیرہ کے الفاظ سے پکارا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالٰے کی حکومت میں کسی اور کو شریک کرنے سے تمام انسانیت کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ اور تمام کارخانۂ وجود کی ترتیب درہم برہم ہو جاتی ہے۔

پیغمبرِ اسلام نے توحید کو تمام نیکیوں پر فضیلت دی اور فرمایا کہ جس طرح جسم انسانی میں دل ہے۔ اسی طرح اسلام میں توحید کا عقیدہ ہے۔ اگر توحید پر ایمان درست ہے۔ تو تمام دوسری نیکیاں بھی درست اور قابل قبول ہوں گی اور اگر اس میں کچھ کمزوری ہے تو دوسرے اعمال بھی کمزور ہوں گے۔

پیکرِ محسوس کے خوگر انسان کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ آن دیکھے خدا کی ہستی کو تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ ہر چیز اس کے سامنے کسی جسم کی صورت میں پیش ہو۔

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر ۔۔۔ مانتا پھر کوئی آن دیکھے خدا کو کیونکر

بانگِ درا ۱۷۸

یہ فطرت ابوجہل کی ہے۔ جو یہ خیال نہیں کرتا کہ حقیقت اولیٰ کو محسوس پیکر میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ صرف محسوس کو تسلیم کرتا ہے۔ اس سے

ادجھل ہر چیز اس فطرت کے لیے معدوم ہے اور غائب سے وابستگی بالکل خطا ہے ؎

دیدہ بر غائب فروبستن خطاست | آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست
پیش غائب سجدہ بردن کوری است | دینِ نو کور است وکوری دوری است

جاوید نامہ ۵۸

اِس فطرت والے انسان معبودِ حقیقی کو سمجھنے کے لیے وہ نور پیدا نہ کر سکے جو انبیاء کی تعلیم سے حاصل ہوتا ہے اور بُت پرستی میں گرفتار ہو گئے۔ انتہائی بُت پرستی کی مثال ملک عرب کے زمانۂ جاہلیت میں ملتی ہے۔ جہاں ہر قبیلہ کا الگ بُت تھا۔ بتوں کو سجدہ کرتے اور ان کے نام پر ہی قربانیاں کرتے[1] اور نفع وضرر کے لئے انہی کی طرف رجوع کرتے۔

بُت پرستوں میں بعض ایسے بھی تھے۔ جو ایک اعلیٰ قوت کے وجود سے تو انکار نہ کر سکے۔ لیکن حقیقت کو بھی نہ پا سکے اور کہنے لگے کہ ہم بتوں کی غلامی اس لیے کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے قریب کردیں۔

---

[1] خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ بُت تھے ان بتوں میں ہبل۔ لات۔ منات اور عزیٰ زیادہ مشہور ہیں جنگ اُحد میں ابوسفیان نے اپنے بڑے بُت کو ہی یاد کر کے اُعلُ ھُبَل کا نعرہ لگایا۔ قرآن کریم میں ان بتوں میں سے نو کے نام بتائے گئے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے تحقیق کر کے ساٹھ بتوں کے نام معلوم کئے ہیں جن کے ساتھ ان قبیلوں کے نام بھی درج کیے ہیں جو خاص طور پر ان بتوں کو پوجتے تھے۔ تفصیل کے لیے سیرۃ النبی جلد چہارم صفحہ ۲۵۲ سے ۲۶۹۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ ۳۹/۳	ہم اُن کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ خدا سے ہم کو قریب کر دیں۔

اسلام اللہ تعالیٰ کی حقیقت کو صفات الٰہی کے صحیح تصور سے ظاہر کرتا ہے تمام انبیاء کرام نے وحی کی روشنی میں انسان کے اندر وہ قلبِ سلیم پیدا کرنے کی کوشش کی جس سے وہ خدا کی صفات کو دیکھ کر اُس کی ہستی کا اقرار کرلیں۔ اسوۂ ابراہیمی کے مطابق اللہ وہ ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۙ وَالَّذِی هُوَ يُطْعِمُنِیْ وَيَسْقِيْنِ ۙ	اللہ وہ ہے۔ جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے راہ دکھاتا ہے۔ وہی کھلاتا اور پلاتا ہے

[۱] شرک کے رد میں صرف یہی ایک چیز کافی ہے کہ سائنس اپنی ترقی کے پورے دور میں بھی معمولی سے معمولی چیز کو پیدا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتی سو درخت کا ایک پتہ اور تیتری کا ایک پَر بنانا اس کے لیے ناممکن ہے۔ سائنس حقیقت کو ظاہر کرنے میں تو امداد دیتی ہے لیکن تخلیق سے عاری ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ	خدا کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ اُس کے (پیدا کرنے کے لیے) سب اکٹھے ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ اور اگر مکھی اُن سے کچھ چھین لے جائے۔ تو اُس کو اُس سے چھڑا (باقی نوٹ اگلے صفحہ پر

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۙ وَالَّذِىْ يُمِيْتُنِىْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۙ وَالَّذِىْ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِىْ خَطِيْٓـَٔتِىْ يَوْمَ الدِّيْنِ - ۲۶/۸۲-۷۸	اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے - وہی مجھے موت دے گا اور پھر زندہ کرے گا اور اُسی سے مجھے یہ اُمید ہے کہ میری خطاؤں کو قیامت کے دن معاف کر دے گا -

بقیہ از صفحہ ۳۵ نوٹ

ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ○ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ عَزِيْزٌ ○ ۲۲/۷۳	نہیں سکتے - طالب و مطلوب کیسے بودے ہیں - اللہ کی جیسی قدر جاننی چاہیئے نہ جانی - (ورنہ) اللہ تو بڑا زبردست (سب پر) غالب ہے -
اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ ۱۶/۱۷	کیا وہ جو سب کچھ پیدا کرتا ہے اس کی مانند ہو سکتا ہے جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتا - کیا یہ لوگ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے -

بقیہ صفحہ ۳۵ نوٹ ۲ : یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ہے کہ وہ ہر چیز کی ابتدا سے انتہا تک پرورش کا خود انتظام کرتا ہے بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی دودھ مہیا کر دیتا ہے - انتہائی شمال میں برف کے اندر بھی کائی اور لچن کو پیدا کر دیتا ہے - اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کے [illegible] ایسا نظام اپنے بندوں کے لیے قائم کرتا ہے جس میں ہر انسان کی پرورش کا انتظام [illegible]

صفاتِ الٰہی کے ذریعہ خدا کا تصوّر کرنے میں انسان کو امداد ملتی ہے لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہُوا ہے کہ ذہنِ انسانی نے اللہ تعالےٰ کی صفات کے تصوّر سے آگے بڑھ کر اُن صفات کے مطابق اللہ کے ایک سے زائد تجسّم کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ یا اس کے برخلاف شرک نے اپنے آپ کو مسئلہ صفات کے پردہ میں چھپا کر پیش کیا اور اس طرح آہستہ آہستہ خدا کی وحدت کی جگہ کثرت نے لے لی۔ ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا بعض دفعہ ایسا بھی ہُوا کہ خود خدا تمام صفات سے خالی رہ گیا اور اُس کی ہر صفت نے علیحدہ مستقل وجود کی صورت میں دیوی دیوتا کا نام پایا۔

صفات کی اس تعبیر اور رَو نے سب سے زیادہ تثلیث کے عقیدہ کو قائم کرنے میں مدد دی اور مختلف مذاہب نے اس عقیدہ کو تسلیم کیا۔ عیسائیت نے باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسٰیؑ) اور رُوح القدس کی

بقیہ صفحہ ۳۵ نوٹ ۲ ۔ اور کوئی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا۔ بشرطیکہ وہ خود اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر نہ بیٹھ رہے۔ اللہ تعالےٰ کی یہ صفت انسانوں کو ہر فرعون کے استبداد سے نجات دلانے کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ قرآن کریم میں رب العالمین۔ (تمام کائنات کا رب) کے لفظ پر بہت زور دیا گیا ہے اور اللہ اور صرف اللہ کو رب ماننے کی تاکید نو سو سے بھی زیادہ دفعہ کی گئی ہے۔ تفصیل کے لیے معارف القرآن جلد اوّل کا مطالعہ کریں۔

تثلیث قائم کی۔ جو حقیقت میں حیات خلق اور علم کی صفتوں کا مجسم مظاہرہ ہے۔ آریہ ورتی مذاہب میں اللہ تعالےٰ کی تین صفات۔ خالق، ممیت (مارنے والا پیدا کرنے والا) اور قیوم نے برہما مہیش اور بشن کا روپ پیدا کر لیا۔ افلاطونی تثلیث خدا، عقل کل اور نفس کُلی کی صورت میں پیش کی گئی یہی وجہ ہے کہ بعد میں یونان نے عیسائی تثلیث کے عقیدہ کو جلدی تسلیم کر لیا اور اُس پر کوئی اعتراض نہ کیا مجوسیوں کے عقیدہ کے مطابق نیکی و برائی کے دو مستقل بالذات خدا ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام اہرمن اور دوسرا یزداں ہے۔ یہ تنویت خدا کی دو صفتوں ہادی اور مضل کی تجسیم کا نتیجہ ہے۔ یہ اور اس قسم کے دیگر غلط فلسفہ نے انسانوں کو اصل مقام سے ہٹا کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار کر دیا۔ عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسےٰ کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا۔ ہندوستان کے بیٹوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی۔ سدا سہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساڑیاں پہن لیں اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے"[1]

اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اُس نے جہاں ہمیں یہ بتایا کہ اللہ تعالےٰ کی صفات کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں۔ وہاں مندرجہ بالا قسم کی جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی اور اس طرح توحیدِ خالص کا پیغام بنی نوع انسان کو پہنچایا[2]۔

حقیقت میں تمام انبیاء کرام توحید کے پیغام پر متفق تھے اور ان کی اصل

---

[1] سیرۃ النبی حصہ چہارم صفحہ ۵۲۱

[2] مفصل بحث کے لیے سیرۃ النبی جلد چہارم صفحہ ۴۹۰ تا ۵۲۷

تعلیم یہی تھی کہ صرف ایک اللہ کی اطاعت اختیار کرو۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ۝ ۲۱/۲۵

اور اے پیغمبر ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس پر اس بات کی وحی نہ کی ہو کہ کوئی معبود نہیں مگر میری ذات پس میری ہی عبودیت اختیار کرو۔

رسول اکرم نے بھی یہی اعلان کیا:۔

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۶/۱۰۲

یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے اُس کے سوا کوئی اور معبود نہیں وہی تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے اُسی کی عبادت کرو۔ وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔

تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ ۳/۶۴

آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور خدائی میں کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور ہم میں سے کوئی بھی کسی کو اللہ کے سوا اپنا رب نہ بنا لے۔

حقیقت یہ ہے کہ روزِ ازل سے ہی فطرت انسانی سے اللہ کی عبودیت کا اقرار لیا گیا تھا اور اسی عہد کو پھر یاد دلایا جاتا ہے تمام انبیاء کرام۔ انسان کو اسی فراموش شدہ عہد کی یاد دلانے کے لیے تشریف لاتے رہے۔ توحید ہی نبوت

کے ساز کا حقیقی و ازلی ترانہ ہے جو بار بار انسانوں کو سنایا گیا۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۳۶/۴	اے افرادِ نسلِ انسانی کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی عبودیت اختیار نہ کرنا۔ بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری عبودیت اختیار کرنا کیونکہ یہی سیدھا راستہ ہے۔

اللہ تعالےٰ نے صاف حکم دیا کہ کسی رسول کو بھی یہ سزاوار نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے خدا کے احکام کی بجائے خود ساختہ احکام کی پیروی کرائے

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ ۳/۷۸	کسی انسان کو یہ سزاوار نہیں کہ اللہ اُسے (انسان کی ہدایت کے لیے) کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اُس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ چاہیئے کہ اللہ کے بندے بنو اس لیے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس لیے کہ اُس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

قوانین الٰہیہ کے مقابلہ میں خود ساختہ آئین کی پابندی کا نتیجہ ہمیشہ فساد

رہا ہے۔ کیونکہ جب انسان اپنے آپ کو مستغنی سمجھ لیتا ہے تو وہ اللہ سے سرتابی اختیار کر لیتا ہے اور دنیوی زندگی کو ہی اپنا منتہائے نگاہ سمجھ کر آخرت پر ترجیح دینے لگتا ہے جیسا کہ قوم عاد اور قوم ثمود وغیرہ جو اس سرکشی کی وجہ سے ہلاک کر دی گئیں۔ خدا کے علاوہ کسی اور نظام کی اطاعت کرنا شرف انسانیت کی تذلیل ہے جو برداشت نہیں کی جاسکتی۔ اسی لیے فرمایا:۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ ‏ ۴/۴۸	بے شک اللہ تعالٰے اس شخص کی مغفرت نہیں کرتا۔ جو اس کے ساتھ شرک کرے اور اس کے سوا جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

چنانچہ جب اختیارات کے متعلق کفار نے دریافت کیا۔

هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ ‏ ۳/۱۵۴

کیا اختیارات میں کچھ ہمارا حصہ ہوگا؟ تو فیصلہ یہ ہوا:۔

قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ ‏ ۳/۱۵۴

جملہ اختیاراتِ حکومت اللہ کے لیے ہیں۔

اس فیصلہ کی وجہ جواز عیاں ہے۔ کیونکہ انسان جب خدا کے احکام کی پیروی چھوڑ دیتا ہے تو اس کے ذہن و فکر کی آزادی اور بلندی جاتی رہتی ہے۔ وہ جہاں میں انسان پرست ہو جاتا ہے کہیں سطوتِ کسریٰ و قیصر کے سامنے جھکتا ہے تو کہیں کاہن و پاپا کی غلامی میں اسیر ہوتا ہے کبھی سلطان و امیر کی پرستش کرتا ہے تو کبھی کامیسا میں رضوان فروش اسقف کے سامنے

سجدہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ غرضیکہ انسانیت کی خوب ہی تذلیل ہوتی ہے۔

بود انسان در جہاں انساں پرست ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ اورنگ و ہم پیر کنشت باج بر کشتِ خرابِ او نوشت
در کلیسا اسقفِ رضواں فروش بہر ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرد خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ رموز ۱۱۹

قرآنی نظام کی رو سے ایک انسان کسی دوسرے انسان کے تابع نہیں اور اسی لیے وہ انسان جنھوں نے قوت کے بل بوتے پر دوسرے انسانوں کو محکوم کیا اور خدا کی عبودیت کی حدود سے تجاوز کر گئے طغیان و سرکشی میں چلے گئے اور ان میں بعض خدا کے ہمسر بھی بن بیٹھے۔ فرعون اسی لیے واجب التعزیر تھا کہ وہ انسانوں کو اللہ کے مقابلہ میں اپنے تابع کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے مصر کے باشندوں سے کہا تھا۔

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۷۹/۲۴	میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں
مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۔ ۲۸/۳۸	میں نہیں جانتا کہ میرے سوا کوئی اور بھی اللہ ہے۔

وہ انسان جو توحید کا قائل ہے اور اپنے آپ کو صرف ایک ہی اللہ

کے در کا محتاج سمجھتا ہے کسی دوسرے آئین کے سامنے نہیں جھک سکتا اور اور نہ دنیاوی طاقت اور قوت اُسے مرعوب کر سکتی ہے۔ اگر انسان اپنی بے بصری کی وجہ سے کسی اور انسان کی بندگی کرے تو وہ اس خوئے غلامی میں جانوروں سے بھی بدتر ہے ؎

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است
من نہ دیدم کہ سگے پیشِ سگِ سر خم کرد

پیام مشرق ۱۵۷

قیصریت کے نظام کے مطابق زمین اور اس کی کل پیداوار خدا کی بجائے بادشاہ کی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔ تمام انسان اُس کے حکم کے تابع اور غلام ہوتے ہیں۔ ایک بچہ جو اتفاق سے شاہی خاندان میں پیدا ہوتا ہے بادشاہ بنتا ہے خواہ اس کی ذاتی قابلیت اور جوہر کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ اسلام ان چیزوں کو زمین میں ایک بڑا شرک اور وجہ فساد قرار دیتا ہے۔ رسول اکرمؐ نے حکومت کی روح کو بدل ڈالا اور صحابہ کرام میں یہ جذبہ پیدا کیا۔ کہ اگر کوئی انسان اپنے طور پر اپنے جیسے دوسرے انسانوں پر خدائی نظام کے برعکس دوسرا نظام کرنا چاہے تو اُس کے اقتدار کو مٹانے کے لیے جان لڑا دینے سے بھی دریغ نہ کریں۔ امیر معاویہ نے جب اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور اُس کے لیے بیعت شروع کی تو اسلامی دنیا کو نئے سرے

سے بادشاہت کا وہ سلسلہ قائم ہوتا دکھائی دیا۔ جس کو مٹانے کے لیے اسلام نے انتہائی کوشش کی تھی۔ چنانچہ حضرت امام حسینؓ نے رمز قرآن سمجھتے ہوئے اس سلسلہ کے خلاف آواز اٹھائی اور واقعہ کربلا کو اسلامی تاریخ میں زبردست شہادت کے طور پر پیش کر دیا ؎

آں امام عاشقاں پور بتولؓ — سرو آزادے ز بستان رسولؐ
در میان امت آں کیواں جناب — ہمچو حرف قُلْ هُوَ اللّٰهُ در کتاب
بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است — پس بنائے لا الہ گردیدہ است
مدعایش سلطنت بودے اگر — خود نکردے باچنیں ساماں سفر
دشمناں چوں ریگ صحرا لا تعد — دوستان او بہ یزداں ہم عدد
تیغ بہر عزت دین است و بس — مقصد او حفظ آئین است و بس
ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست — پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خون او تفسیر ایں اسرار کرد — ملت خوابیدہ را بیدار کرد
رمز قرآں از حسینؓ آموختیم — ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم

تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

رموز ۱۲۸

اسی حقیقت کے پیش نظر جابر و ظالم فرمانروا کے سامنے حق بات کہنے کو قابل تعریف قرار دیا گیا۔ حضور کا ارشاد ہے کَلِمَةُ الْحَقِّ عِنْدَ السُّلْطَانِ الْجَائِرِ اَجْرُ مِائَةِ شَهِيدٍ۔ بندۂ مومن کو ایسے فرمانروا کی قوت و شوکت مرعوب نہیں کر سکتی ؎

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرمانروا کے سامنے بے باک ہے

بانگ درا ۲۱۰

اگر حقیقت کو دیکھا جائے تو فرعونی قسم کے نظام کی طاقت و قوت غیر کے جذبۂ عقیدت و ارادت کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔ جب تک وہ انہیں تسلیم کرتے رہیں۔ ان کی قیادت و سیادت قائم رہتی ہے اور جب وہ ان سے روگرداں ہو جائیں۔ ان کی حکومت بھی فنا ہو جاتی ہے ؎

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خدا ست
چوں یکے اندر قیام آئی فنا ست

زبورِ عجم ۲۵۸

یہ صرف حق تعالیٰ کی ذات ہی ہے جو اپنی قوت پر قائم ہے اور جو محکوم کے جذبۂ اطاعت کی محتاج نہیں۔ توحید وہ نقطہ ہے جس کے گرد سارا عالم چکر لگا رہا ہے ؎

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ   انتہائے کارِ عالم لا الٰہ

رموز ۱۶۱

توحید کو صحیح طور پر سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے انسان کو دو مقامات طے کرنے پڑتے ہیں۔ ایک سلبی دوسرا ایجابی۔ ایک کو لا اور دوسرے کو اِلّا سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ انہی دو اہم اجزا سے مرکب ہے۔ لفظ اِلٰہ سے مراد ہر ایک

معبود ہے اور اللہ کا لفظ صرف ایک معبودِ حقیقی کے لیے مخصوص ہے۔ یہ لفظ کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہو سکتا۔ جس وقت ہم لَآ اِلٰہَ کہتے ہیں تو یہ اقرار کرتے ہیں کہ کسی قسم کا کوئی بھی معبود نہیں ہے اور جب دوسرا حصہ اِلَّا اللّٰہ کہتے ہیں تو یہ اعلان کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ عبادت و پرستش کے قابل نہیں۔ لا کے ذریعہ پہلے پرانی عمارت کو مسمار کیا جاتا ہے اور پھر اس پر اِلَّا کے ذریعہ نئی اور شاندار عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ گل و گلزار لگانے کے لیے کھیت میں سے فصل کو خراب کرنے والے پودے نکال دئے جاتے ہیں۔ نئے مکین کو اطمینان سے بسانے کے لیے پہلے مکان کو خالی کیا جاتا ہے۔ توحید کو استوار کرنے کے لیے پہلے زمین صاف اور ہموار کی جاتی ہے۔ لا کے ذریعہ تمام طاقتوں کی نفی کی جاتی ہے لیکن اسی سانس میں اِلَّا کے ذریعہ ایک اور صرف ایک قوت کا اقرار کیا جاتا ہے۔

اس مسئلہ کی مزید تشریح کے لیے ہم سورۃ انعام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جہاں حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا ایک واقعہ درج ہے کہ جب رات ہوئی تو آپ نے ایک چمکتا ہوا تارا دیکھا اور کہا ھٰذَا رَبِّیْ۔ یہ میرا رب ہے۔ لیکن جب تارا غروب ہو گیا تو آپ نے کہا لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۔ میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اب چاند نکل آیا تو آپ نے کہا یہ میرا رب ہے لیکن چاند بھی غروب ہو گیا۔ اور سورج پوری آب و تاب سے نکلا۔ تو آپ نے کہا:۔

هٰذَا رَبِّيْ هٰذَا اَكْبَرُ لیکن سورج بھی غروب ہو گیا۔ یہ واقعہ
آپ کی چشمِ جہاں بیں کو روشن تر کرنے کے لیے کافی تھا ؎

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل

بانگ درا ۲۹۲

یہ لَا کا مقام تھا جس میں تارے۔ چاند اور سورج کی بتدریج نفی کی گئی۔
لیکن غیر طاقتوں کی عبودیت سے انکار پر آپ کا کام ختم نہیں ہو گیا۔ ابھی
اِلَّا یعنی اثباتِ حق کا اعلان باقی تھا چنانچہ آپ نے فرمایا۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ ۷/۸	میں نے تو ایک کا ہی ہو کر اپنا رُخ اسی ذات پاک کی طرف پھیر لیا ہے جس نے آسمان و زمین کو بنایا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

حقیقت بین آنکھوں کے لیے یہی نکتہ تمام بتوں کو توڑنے کے لیے
کافی ہے ؎

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لَا اِلٰہ میں ہے

بال جبریل ۹۹

ان حقائق کو قرآن کریم میں زیادہ وضاحت سے بھی بیان کیا گیا ہے
ارشاد ہوتا ہے۔

اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ۲/۱	خدا کی عبادت کرو۔

اور یہ بھی حکم دیا جاتا ہے:-

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا ۲/۲۲ | کسی غیر خدا طاقت کی غلامی نہ کرو۔

توحید صرف خدا کی عبادت سے قائم نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے لیے غیر اللہ کے بندھنوں سے آزاد ہونا لازمی ہے ؎

لا و اِلّا احتسابِ کائنات — لا و اِلّا فتح بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون — حرکت از لا زاید از اِلّا سکون
تا نہ رمزِ لا الہ آید بدست — بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

پس چہ باید کرد ۱۹

غیر خدائی نظام سے قطع تعلق ضروری ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم دونوں سے اپنا تعلق قائم رکھیں اور مسلمان کہلا سکیں اِلَّا اللہ پر ایمان رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے عمل سے لا اِلٰہ کو ثابت کریں۔ حق و باطل اور قرآنی و غیر فطری نظام کے اجزا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۲/۸۵ | کیا کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے۔

مسلمان لا الٰہ سے شروع ہو کر انجام کار الا اللہ کی منزل پر پہنچ کر اللہ کی محکومیت کا اقرار کرتا ہے اور اسی محکومیت سے دنیا پر حکومت کرتا ہے ؎

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست — ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست

لا مقام ضرب ہائے پے بہ پے	ایں غو رعد است نے آواز نے
ضرب او ہر بود را سازد نبود	تا بروں آئی زگرداب وجود
ہر کہ اندر دست او شمشیر لا ست	جملہ موجودات را فرماں رواست

پس چہ باید کرد ۱۹ - ۲۲

کارگہ حیات میں کئی دفعہ ایسے مواقع بھی آئے ہیں جب انسان نے فرسودہ قوانین اور نظام کو جو انسانیت کی تذلیل کرنے والا تھا توڑ دیا۔ لیکن اُن کی موت اس وجہ سے ہو گئی کہ وہ اُس کی جگہ کوئی بہتر نظام قائم نہ کر سکے ؎

نہاد زندگی میں ابتدا لا انتہا الّا

پیام موت ہے جب لا ہوا الّا سے بیگانہ

وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی

یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

ضرب کلیم ۶۰

گو نفی ضروری ہے لیکن نفی پر زندگی کا قیام نہیں ہو سکتا نفی بے اثبات کو مرگ امتاں کہا ہے ؎

در مقام لا نیا ساید حیات	سوئے الّا می خرامد کائنات
لا و الّا سازو برگ اُمتاں	نفی بے اثبات مرگ اُمتاں
در محبت پختہ کے گردد خلیل	تا نگردد لا سوئے الّا دلیل

پس چہ باید کرد ۲۲

اسی تیغ سے باطل کو فتح کرنے کی تلقین کی ہے ؎

اے کہ خوردستی زمینائے خلیلؑ   گرمیٔ خونت ز صہبائے خلیلؑ
برسرِ این باطلِ حق پیرہن   تیغِ لَا موجُودِ اِلّا ھُوْ بزن

رموز ۱۶۳

فلسفہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ بعض حکما لا کے چکر میں آایسے پھنس گئے کہ اِلّا کی طرف اُن کے قدم نہ اُٹھ سکے جرمنی کا مشہور مجذوب فلسفی نطشہ (۱۸۴۴ - ۱۹۰۰) اسی چکر میں رہا۔ اُس نے ۱۸ سال کی عمر میں لا الٰہ کا اعلان کیا۔ اس کے بعد تقریباً چالیس برس وہ اثبات ذات کے لیے فلسفہ کی پُرپیچ وادیوں میں سرگرداں رہا۔ لیکن "وہ اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کرسکا اور اس لیے اس کے فلسفیانہ افکار نے اُسے غلط رستہ پر ڈال دیا" جس اثبات کی اُسے تلاش تھی۔ وہ تنہا فلسفہ کی حدود سے ماورا ہے۔ کشتِ دل سے پیدا ہونے والے خوشہ کو اُس نے آب و گل میں تلاش کیا اور ناکام رہا ؎

خواست تا بیند بچشمِ ظاہری   اختلاطِ قاہری با دلبری
خواست تا از آب و گل آید بروں   خوشۂ کز کشتِ دل آید بروں
آنچہ او جویاِ مقامِ کبریاست   این مقام از عقل و حکمت ماوراست

جاوید نامہ ۱۷۷

روح اور خدا کی ہستی کا وہ قائل نہ تھا۔ اس لیے عدل کے مقابلہ میں قوت و اقتدار کے فیصلوں کو جائز سمجھتا تھا۔

لَا کے بھنور نے اُس میں توحید کی اصل حقیقت کو پانے کی نگاہ پیدا نہ ہونے دی اور وہ وہم اور دماغی قیاس آرائیوں کا تختۂ مشق بن گیا ؎

جبریلیت نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم — نگاہ چاہیئے اسرار لا الہ کے لیے

ضرب کلیم ۵۳

علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں نطشہ کا ذکر کیا ہے ؎

دیدۂ او از عقاباں تیز تر — طلعتِ او شاہد سوزِ جگر
دمبدم سوزِ درونِ او فزود — بر لبش بیتے کہ صد بارش سرود

"نہ جبریلے نہ فردوسے نہ حورے نے خداوندے
کفِ خاکے کہ می سوزد زجان آرزومندے" جاوید نامہ ۱۷۶

پیر رومی اقبال کو بتاتے ہیں کہ اس کے ہم نشین اس کے جذبہ کو نہ سمجھ سکے اور اُسے مجنوں کا خطاب دیا۔ وہ عشق و مستی سے محروم مقام لا میں پھنس کرر ہ گیا ؎

من برومی گفتم ایں دیوانہ کیست؟ — گفت "ایں فرزانۂ المانوی است
درمیانِ ایں دو عالم جائے اوست — نغمۂ دیرینہ اندر نائے اوست!
باز ایں حلاجِ بے دار و رسن — نوعِ دیگر گفتہ آں حرفِ کہن!
حرفِ او بے باک و افکارش عظیم — غربیاں از تیغِ گفتارش دو نیم!
مردِ رہ دانے نبود اندر فرنگ — پس فزوں شد نغمہ اش از تارِ چنگ!
نقد بود و کس عیارِ او را نکرد — کاردانے مردِ کار او را نکرد!
عاشقے در آہِ خود گم گشتۂ — سالکے در راہِ خود گم گشتۂ!
مستیٔ او ہر زجاجے را شکست — از خدا ببرید و ہم از خود گسست!
او بہ لا درماند و تا اِلّا نرفت — از مقامِ عبدہٗ بیگانہ رفت!
با تجلی ہمکنار و بے خبر — دور تر چوں میوہ از بیخ شجر!

جاوید نامہ ۱۶۸

وہ حضرت موسیٰ کی طرح طالبِ دیدار تھا۔ اس وقت اُسے کسی مردِ کامل کی ضرورت تھی۔ اگر اُسے شیخ احمد سرہندیؒ کی طرح کے روحانی اُستاد مل جاتے تو وہ یقیناً حقیقت کو پا لیتا۔ کیونکہ اُس کے بنیادی خیالات درست تھے ؎

مثلِ موسیٰ طالبِ دیدار بود

کاش بودے در زمانِ احمدے تارسیدے بر سرورِ سرمدے

جاوید نامہ ۱۶۸

نطشے خود اپنی روحانی تربیت[1] کی ضرورت کو محسوس کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں ایک بھاری مسئلہ کے حل کرنے کے لیے تنہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے میں ایک جنگل میں کھویا گیا ہوں۔ تذبذب و گمان کے جہنم سے نکلنے کے لیے مجھے امداد کی ضرورت ہے مجھے پیروی کرنے والے بھی درکار ہیں اور مرشد بھی۔ اُس کی مطابعت کتنی شیریں ہوگی۔ مجھے تمام زندہ افراد میں کیوں ایسی ہستی نہیں ملتی۔

[1] مردِ کامل کی تربیت کے نتائج قرآن کریم میں حضرت موسیٰ و حضرت شعیب کی ذات میں بیان کیے گئے ہیں جب حضرت موسیٰ ایک قبطی کو مار کر بھاگ گئے تو ایک بزرگ حضرت شعیب سے ملاقات ہوئی جہاں وہ کئی سال اُن کی بھیڑ بکریاں چراتے رہے دیکھنے میں تو یہ عرصہ ایک چرواہے کی زندگی کا تھا۔ لیکن حقیقت میں تربیت کا ایسا زمانہ تھا جس نے بھیڑ بکریاں چرانے والے گڈریے کو کلیم اللہ بنا دیا تھا ؎

دمِ عارف نسیمِ صبح دم ہے اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے

اگر کوئی شعیب آئے میسر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

بالِ جبریل ۱۲۵

اسی حقیقت کو ایک اور شعر میں بھی بیان کیا ہے ؎

یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں ہوائے دشت و شعیب و شبانیِ شب و روز

ضربِ کلیم

جس کی نظر مجھ سے زیادہ بالغ ہو۔ کیا میں نے اُس کی پوری تلاش نہیں کی۔ مجھے اُس کے ملنے کی بڑی تمنّا ہے۔

اِس سے ظاہر ہے کہ وہ خدا کی تلاش میں تھا۔ لیکن شوپنہار اور ڈارون کی ذہنی تقلید نے حقیقت اُس پر ظاہر نہ ہونے دی۔ اُس کا دل مومن تھا۔ لیکن دماغ کافر[1] رہا۔

آنکہ بر طرح حرم بت خانہ ساخت

قلبِ او مومن دماغش کافر است پیام مشرق ۲۴۱

بعض دفعہ قومیں بھی اسی قسم کے چکر میں پھنس جاتی ہیں مثال کے طور پر اشتراکیت نے لا سلاطین لا کلیسا، اور لا الٰہ کا نعرہ لگایا۔ لیکن لا سے الّا کی جانب اس کے قدم سُست پڑ گئے۔ اگر وہ اسی چکر میں رہی تو گوہر مقصود سے محروم رہے گی (اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)

لا و اِلّا کے مقامات طے کرنے اور بیم و شک سے گزرنے کے لیے اسلامی توحید میں بے پناہ کشش ہے۔

نگر الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں ۔۔۔ خرد کھوئی گئی ہے چار سُو میں

نہ چھوڑ اے دل فغان صبح گاہی ۔۔۔ اماں شاید ملے اللہ ہُو میں

[1] اُس کا دماغ اس لیے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے۔ گو بعض اخلاقی نتائج میں اُس کے افکار مذہب اسلام سے بہت قریب ہیں۔ نبی کریم نے اس قسم کا جملہ اُمیّہ ابن الصلت عرب شاعر کی نسبت کہا تھا۔ "اٰمَنَ لِسَانُہٗ وَکَفَرَ قَلْبُہٗ"

پیام مشرق صفحہ ۲۴۱

توحید کے جذبہ سے سرشار ہو کر انسان دین و حکمت اور آئین سے روشناس ہوتا ہے۔ بیم و شک سے گزر کر سرگرم عمل ہو جاتا ہے اور اس طرح ضمیر کائنات کو پا لیتا ہے ؎

در جہانِ کیف و کم گردید عقل ‏ ‏ ‏ پے بہ منزل بُرد از توحید عقل
ورنہ این بیچارہ را منزل کجاست؟ ‏ ‏ ‏ کشتیٔ ادراک را ساحل کجاست؟

رموز ۱۰۷

جذبۂ توحید بے پناہ قوت کا حامل ہے۔ زندگی میں توحید کا قائل ایک تیغِ جوہر دار کی طرح ہے جس کے پاس لا الٰہ کی کاری ضرب ہر دم موجود رہتی ہے ؎

این دو حرفِ لا الٰہ گفتار نیست ‏ ‏ ‏ لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست!
زیستن با سوزِ او قہاری است ‏ ‏ ‏ لا الٰہ ضرب است و ضرب کاری است

جاوید نامہ ۲۳۴

یہ قوتِ افراد اور ملت دونوں کو یکساں فائدہ دیتی ہے توحید دونوں کے لیے ایک جیسی قوت و جبروت کا سرچشمہ ہے اس سے افراد لاہوتی بنتے ہیں اور ملت جبروتی ؎

فرد از توحید لاہوتی شود! ‏ ‏ ‏ ملت از توحید جبروتی شود
ہر دو از توحید می گیرد کمال ‏ ‏ ‏ زندگی این را جلال آن را جمال

ملتے چوں می شود توحید مست
قوت و جبروت می آید بدست ‏ ‏ ‏ جاوید نامہ ۲۲۶

انبیاء کرام نے عملاً اس نظام کو قائم کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جس سے صرف قوانین الٰہیہ کی عبودیت ضروری ہوتی ہے۔ توحید مسلمانوں کا صرف مذہبی عقیدہ ہی نہیں بلکہ اس پر تمام اسلامی تمدن و سیاست کی بھی بنیاد ہے۔ توحید کا مطلب وحدت فی الخیال والعمل ہے۔ وحدت خیال کے ساتھ اشتراک عمل لازم ہے ؎

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ فقیہ　　وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

ضرب کلیم ۱۸

اسلامی تمدن و سیاست کی یہ بنیاد ملّتِ بیضا کے لیے تن و جان دونوں کا حکم رکھتی ہے ؎

ملّت بیضا تن و جاں لا الٰہ　　ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ

لا الٰہ سرمایۂ اسرار ما　　رشتہ اش شیرازۂ افکار ما

رموز ۱۰۶

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا اسلام کا سیاسی نظام بھی عقیدۂ توحید کی تفسیر ہے۔ یہ نظام مملکت کا ماخذ اُسی ذات بے ہمتا کو قرار دیتا ہے ؎

سروری زیبا فقط اُس ذات بے ہمتا کو ہے　　حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

بانگ درا ۲۹۶

ارشاد ربانی ہے:۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ	(تمام جہان میں) حکومت تو بس ایک اللہ کی ہی ہے اور اس نے حکم دیا ہے کہ صرف

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۱۲/۴۰	اُسی کی پرستش کرو۔ یہی دین کا سیدھا رستہ ہے۔ مگر افسوس اکثر لوگ نہیں جانتے۔
اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ط وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۵/۵۰	کیا اس وقت میں زمانۂ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور جو لوگ یقین کرنے والے ہیں ان کے لیے اللہ سے بہتر حکم دینے والا اور کون ہو سکتا ہے۔
فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ۴۰/۱۲	اللہ ہی کے لیے حکومت ہے۔ جو عالی شان اور سب سے بڑا ہے وہ سب حکم کرنے والوں سے بہتر ہے۔
وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۱۰/۱۰۹	

ان آیات میں اُن مسلمانوں کے لیے درس عبرت ہے جو توحید کا اقرار کرتے ہُوئے کئی قسم کی غلامی کا شکار بنے رہتے ہیں اور اپنے زعم میں یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم بتوں کی پرستش نہیں کرتے حالانکہ بُت سے مراد صرف پتھر کی مورتی نہیں بلکہ وہ تمام بت ہیں جو مختلف پیکروں میں جلوہ گر رہتے ہیں قرآن کریم نے اس قسم کی بُت پرستی کی ممانعت ان الفاظ میں کردی ہے :۔

لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا ۳/۶۴	اُس کے ساتھ کچھ بھی شریک نہ لاویں۔

اور ساتھ ہی مزید تشریح کے لیے اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۳/۶۴ (سوائے اللہ کے کسی اور کو) فرما کر انسان کو اللہ تعالےٰ کی محکومی کے علاوہ باقی ہر قسم کی غلامی سے بے نیاز کردیا۔ اللہ تعالےٰ کا ایک سجدہ انسان کو دوسرے

ہزاروں سجدوں سے نجات بخش دیتا ہے ؎

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات ضربِ کلیم ۳۲

وہی ایک سجدہ انسانیت کے اہتمام کے قابل ہے ؎

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
بالِ جبریل ۱۷۳

احکام الٰہی کے علاوہ ہر قسم کی اطاعت میں ایسی غلامی کا شکار ہونا پڑتا ہے جس میں روٹی کے ٹکڑے کے لیے متاعِ انسانیت لوٹ لی جاتی ہے ؎

آں خدا نانے دہد جانے دہد این خدا جانے برد نانے دہد
آں خدا یکتاست ایں صد پارہ ایست آں ہمہ را چارہ ایں بیچارہ ایست
زبورِ عجم ۲۵۹

یہ درست ہے کہ اسلام امیر کی اطاعت کا حکم دیتا ہے لیکن اس لیے کہ اس ایک حاکم نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ تمام قوانین اس وقت تک تک قابلِ عمل ہیں۔ جب تک وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہوں۔ صدیقِ اکبرؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا:۔

اَطِیْعُوْنِیْ مَا اَطَعْتُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِذَا عَصَیْتُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَلَا طَاعَۃَ لِیْ عَلَیْکُمْ۔	جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو۔ جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر لازم نہیں ۔

خدا کے حکم کے مقابلہ میں اپنے نفس کی پیروی۔ دنیا دی جاہ و جلال والے اشخاص یا مذہبی پیشوایان کی اطاعت اور اسلاف پرستی میں کسی کو بھی ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ یہ ایسی رکاوٹیں ہیں جو مومن کے رستہ میں حائل ہوتی ہیں اور جنہیں ہٹانا اس کے لیے ازبس ضروری ہے۔

اللہ تعالےٰ کے احکام کو چھوڑ کر نفس کی غلامی کرنے والے اشخاص کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ع ۲۸/۵

اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی ہدایت کی بجائے اپنی (نفسانی) خواہش کی پیروی کرے بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

علامہ اقبال نے نفس کو شتر کی مانند خود پرست و خودسر کہا ہے اور ضبطِ نفس کی تعلیم دی ہے جو تربیتِ خودی میں ضروری مرحلہ ہے ؎

نفسِ تو مثلِ شتر خود پرور است | خود پرست و خود سوار و خودسر است
مردِ شو آور زمامِ او بکف | تا شوی گوہر اگر باشی خزف
ہر کہ برخود نیست فرمانش رواں | می شود فرماں پذیر از دیگراں

اسرار ۴۶

رسول اکرم صلعم سے پہلے بعض لوگ انبیاؑ یا پیشوایانِ مذہبی کو اس بات کا مجاز سمجھتے تھے کہ وہ جس چیز کو چاہیں۔ حلال ٹھہرا دیں۔ قرآن مجید میں

جب یہ آیت اُتری۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا ۹/۳۱	اِن لوگوں نے اپنے علما اور درویشوں کو رب بنالیا ہے۔

تو حضرت عدیؓ نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے۔ آنحضرت صلعم سے عرض کی کہ ہم لوگ اپنے پیشوایان مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کردیں، عرض کی کہ 'ہاں'۔ آپ نے فرمایا 'یہی رب بنانا ہے'[1]

یہی حالت اُن لوگوں کی ہے جو دنیاوی جاہ و حشم کی پرستش کرتے ہیں اور جن کے خلاف مومن کا نعرہ یہ ہوتا ہے ؎

ز آستانۂ سلطاں کنارہ می گیرم
نہ کافرم کہ پرستم خدائے بے توفیق زبورِ عجم ۱۶۱

اُن لوگوں کے متعلق جو خدا کے حکم کے مقابلہ میں اپنے باپ دادا کے رسم و رواج اور تمدن پر عمل کرتے ہیں اور ہر قدیم چیز کو تقدس کا رنگ دے کر تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں ارشاد ربانی ہے:۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ	اسی طرح ہم نے تم سے پہلے جب کبھی کسی گاؤں میں کوئی (پیغمبر) ڈر سنانے والا بھیجا۔ وہاں کے آسودہ لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ

[1] سیرۃ النبی جلد چہارم صفحہ ۴۲۹

وَّ اِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۔ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ط قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ؏ $\frac{43}{23-25}$	دادوں کو ایک طریقے پر پایا اور انہی کے قدم بہ قدم ہم ان کی پیروی کر رہے ہیں (اس پر ان کے پیغمبر نے ان سے) کہا کہ جس طریقے پر تم نے اپنے باپ دادوں کو پایا اگر میں اس سے کہیں سیدھا راستہ لے کر تمہارے پاس آیا ہوں تو بھی (تم اسی پرانے رستے پر چلے جاؤ گے وہ لیے (کچھ بھی ہو) جو دین تم کو دیکر بھیجا گیا ہے ہم تو اس کو ماننے والے ہی نہیں ۔ آخر کار ہم نے اُن سے (ان کی سرکشی کا) بدلہ لیا دیکھو جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا ۔

اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کا یہی جذبہ حضرت ابراہیم کی دعوت حق وصداقت کے مقابلہ میں قوم کی طرف سے پیش کیا گیا۔ جب انہوں نے کہا:۔

قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ $\frac{21}{53}$	ہم نے تو اپنے باپ دادوں کو انہی خداؤں کی بندگی کرتے ہوتے پایا ہے۔

حضرت موسےٰ کو بھی یہی جواب دیا گیا تھا:۔

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ط وَمَا نَحْنُ	وہ کہنے لگے کیا تم ہمیں اس رستہ سے ہٹانا چاہتے ہو جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور ملک میں تم دونوں (دونوں بھائیوں) کی بڑائی ہو اور ہم تو تم پر ایمان

لکھا۔ بموٗمنیں، ہے ۲ | لانے والے ہیں نہیں۔

آنحضرت صلعم جب لوگوں کو اسلام کا پیغام سناتے اور توحید کی دعوت دیتے تو ابولہب آپ کے اثر کو زائل کرنے کے لیے یہی ہتھیار استعمال کرتا کہ لوگو یہ تو تمھیں تمہارے باپ دادا کے مذہب سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح جب آپ اپنے چچا ابوطالب کے پاس بوقت نزع توحید کا پیغام لے کر گئے تو ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ نے انھیں یہی کہہ کر باز رکھا کہ کیا تم آبائی مذہب کو چھوڑ دوگے اور اپنے باپ کے دین سے پھر جاؤ گے۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تخیل اسلام اور توحید کے رستہ میں کیسا سنگِ گراں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس گمراہی پر بہت زور دیا ہے اور آباو اجداد سے متوارث سلک کے مقابلہ میں وہ قندیل روشن کی ہے۔ جو حق و باطل کو الگ الگ کر کے دکھا دیتی ہے اور جس کے سامنے آباو اجداد کے تمام طور طریقے بلکہ زن و اولاد کے بندھن بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ ملت حنیفہ کے موسس اولیٰ حضرت ابراہیمؑ کی صفات تسلیم و رضا اسی جذبۂ توحید کی پیدا کردہ تھیں ؎

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد | فارغ از بندِ زن و اولاد شد
می کند از ماسوے قطع نظر | می نہد ساطور بر حلقِ پسر

اسرار ۷۴

ان تمام خرابیوں کی بنیاد بیم غیر اللہ ہے جو انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے کافی ہے ؎

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست	اصلِ او بیم است اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ	این ہمہ از خوف می گیرد فروغ

رموز ۱۱۰

'خوفِ غیر' شرک ہے اور 'خوفِ حق' ، ایمان کا عنوان ہے ؎

خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس	خوفِ غیر از شرکِ پنہاں است و بس

رموز ۱۱۴

شیطانی قوتوں کا ایک بڑا حربہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں خوف و حزن پیدا کر کے حق کے رستہ سے بھٹکا دیتی ہیں۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۖ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ۳/۱۷۵	یہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ شیطان تھا جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے ڈرانا چاہتا تھا۔ اُن سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔

اس حقیقت کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے ؎

بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است	کاروانِ زندگی را رہزن است
تخمِ او چوں در گلت خود را نشاند	زندگی از خود نمائی باز ماند

ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است رموز ۱۰۹

صبحِ ہجرت جب نبی اکرمؐ صدیق اکبرؓ کے ساتھ غار میں موجود تھے اور دشمن قریب آگیا تو رفیقِ غار کو پریشانی ہوئی کہ کہیں حضورؐ کو ایذا نہ پہنچے

نور رسالت نے پورے یقین سے فرمایا:۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ، ۹/۴۰ | مت غم کھاؤ۔ تحقیق اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

مسلمانوں کو اسی تعلیم کی تلقین کی ہے ؎

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر　　از نبیؐ تعلیم لَاتَحْزَنْ بگیر
این سبق صدیقؓ را صدیق کرد[1]　　سرخوش از پیمانۂ تحقیق کرد

گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو　　رموز ۱۰۹

حضرت موسےٰؑ جب فرعون کے مقابلہ میں گئے۔ اور جادو گروں کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن کر دوڑنے لگیں تو ارشاد باری تعالےٰ ہوا کہ مت خوف کھاؤ

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ، ۲۰/۶۸ | ہم نے کہا اندیشہ نہ کر۔ تو ہی غالب رہے گا۔

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود　　قلبِ او از لَاتَخَفْ محکم شود　　رموز ۱۰۹

قوتِ کلیمی کے سامنے سرکشی اور استبداد کی قوتیں ہمیشہ ماند پڑ جاتی ہیں ؎

---

[1] صدیقؓ اکبر کی زندگی کے واقعات کو علامہ مرحوم نے بڑی خوبی سے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے ؎

ہمت او کشتِ ملت را چو ابر　　ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر
رموز ۱۸۱

مردِ حُر محکم ز وِردِ لَا تَخَفْ | ما بمیداں سر بجیب، او سر بکف
پادشاہاں در قبا ہائے حریر | زرد رُو از سہمِ آں عریاں فقیر

پس چہ باید کرد ۳۲

دلِ بیباک و دل ترسندہ کا مقابلہ کیا ہے ؎

دلِ بیباک را ضرغام، رنگ است | دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحرا است | اگر ترسی بہرِ موجش نہنگ است

پیامِ مشرق ۵۹

مومن ہر قسم کے خوف سے مامون رہتا ہے ؎

خوفِ دنیا خوفِ عقبیٰ خوفِ جاں | خوفِ آلامِ زمین و آسماں
حُبِّ مال و دولت وحبِّ وطن | حبِّ خویش واقربا و حُبِّ زن
تا عصائے لا الٰہ داری بدست | ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش | خم نگردد پیشِ باطل گردنش

خوف را در سینۂ او راہ نیست
خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست اسرار ۴۷

بندۂ حق کی تعریف کی ہے جو اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ؕ ۲۹/۳۶
(کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں) کے فرمانِ خداوندی کی تفسیر ہے ؎

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست | زندگانی گردشِ دولاب نیست
مسلم استی بے نیاز از غیر شو | اہلِ عالم را سراپا خیر شو
پیشِ منعم شکوہ گردوں مکن | دستِ خویش از آستیں بیروں مکن

رزق خود را از کف دو ناں مگیر یوسف استی خویش را ارزاں مگیر
"پشتِ پا زن تختِ کیکاؤس را سر بدہ از کف مدہ ناموس را"

رموز ۱۸۷

از پیامِ مصطفےٰ آگاہ شو
فارغ از اربابِ دون اللہ شو رموز ۱۸۸

جو انسان اس تعلیم سے لاپروا رہتے ہیں۔ اُن کے لیے اُس دن کی یاد دہانی ہے۔ جب وہ اپنے خداوندوں کو پکاریں گے۔ لیکن کوئی جواب نہ پائیں گے۔

وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ ۲۸/۶۴	اُن سے کہا جائیگا کہ اپنے اُن شریکوں کو (جنھیں تم شریک خدائی سمجھتے تھے) بلاؤ۔ چنانچہ یہ لوگ اُن کو پکاریں گے مگر وہ اُن کو جواب تک بھی نہ دیں گے۔

وہ دن یقیناً اُن کے لیے بہت ہی سخت ہوگا۔

وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِينَ عَسِيرًا ۲۵/۲۶	اور وہ کافروں کے لیے بڑا ہی سخت دن ہوگا۔

اَلْاَرْضُ لِلّٰه

تو عقابی طائف افلاک شو | بال و پر بکشا و پاک از خاک شو
باطن اَلْاَرْضُ لِلّٰه ظاہر است | ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

جاوید نامہ ۸۱

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔ انسان کا غیر اللہ کے سامنے جھکنا انسانیت کی تذلیل ہے۔ اس ذلت و گمراہی کے اسباب پر غور کرنے سے ہمیں کتنے ہی ایسے انسان نظر آتے ہیں جن کی متاعِ انسانیت روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے لوٹ لی جاتی ہے۔ اس لیے توحید کی روح کے عین مطابق اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ رزق کے معاملہ میں خدائے برتر کے علاوہ کوئی ایسی طاقت نہیں۔ جس کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جائے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ۔ ۵۱/۵۸ | بے شک اللہ ہی روزی دینے والا بڑی قوت والا زبردست ہے۔

کوئی مادہ پرست بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ رزق کے مہیا کرنے کا نظام کبھی انسان کا پیدا کردہ ہے۔

یَاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ | اے نوعِ انسانی تم پر جو خدا کے احسانات ہیں۔ ان کو یاد کرو۔ کیا

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ ٣٥/٣

اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے۔ جو تم کو زمین سے اور آسمانوں سے رزق پہنچاتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ سو تم کہاں اُلٹے جارہے ہو۔

پیٹ کی خاطر بنی نوع انسان کی تذلیل کرنے والا شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَيْئًا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ ١٦/٧٣

یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی ہستیوں کے سامنے جھکنے لگ جاتے ہیں جو زمین و آسمان سے رزق دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ ہی اُنھیں کسی بات کی قوّت حاصل ہے۔

اسلام میں ملکیّت خدا کی امانت ہے اور سرمایہ اور دولت بھی حقیقت میں خدا ہی کے تصرف میں ہیں۔ یہ درست ہے کہ رزق کے پیدا کرنے میں انسان کی جدوجہد کا بہت بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اصلی اسباب قدرت نے پہلے مہیا کر دئے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ قانون قدرت کے مطابق اسباب پیدا نہ کرے اور وہ وسائل مہیا نہ کرے جو ضروری ہیں تو تمام انسانی کوشش بیکار ہو کر رہ جائے۔ اللہ تعالےٰ نے اس مطلب کے لیے زمین کو ذریعۂ معاش بنادیا ہے۔

وَ جَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ ط ۱۰/۲	اور اُس میں تمہارے لیے معیشیں مہیا کیں۔

اِسی لطف و کرم کے ماتحت اللہ تعالےٰ نے زمین سے پیدا ہونے والی معاش کو انسان کے لیے انعام اور متاع کے الفاظ سے پکارا:۔

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِہٖٓ ۙ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۙ فَاَنْۢبَتْنَا فِیْھَا حَبًّا ۙ وَّعِنَبًا وَّ قَضْبًا ۙ وَّ زَیْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ۙ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ وَّ فَاکِھَۃً وَّ اَبًّا ۙ مَّتَاعًا لَّکُمْ وَلِاَنْعَامِکُمْ ط ۸۰/۲۴-۳۲	انسان کو چاہیئے کہ اپنے کھانے کی طرف بھی نظر کرے کہ ہم (ہی) نے اُوپر سے پانی برسایا پھر ہم نے (ہی بیج کو ایسی طاقت دی کہ اس نے) زمین کو پھاڑا۔ پھر ہم نے ہی زمین میں یہ سب کچھ اُگایا یعنی غلّہ اور انگور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارا یہ سب کچھ اس لئے کہ تم لوگوں کو اور تمہارے چارپایوں کو فائدہ پہنچے۔

ملک اور متاع الگ الگ چیزیں ہیں۔ ملکیت اللہ تعالےٰ کی ہے۔ لیکن انسان اُس ملکیت سے رزق حاصل کر کے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور یہ اُن کے لیے جائز ہے۔ لیکن اُس عارضی فائدہ اور حصولِ رزق سے یہ خیال کرنا کہ وہ دوسروں کے رازق بھی ہیں۔ کسی طرح جائز نہیں ؎

رزق خود را از زمین بردن رواست   ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست

بندۂ مومن امین، حق مالک است　　غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

جاوید نامہ ۔ ۹۰

فرعون کا دعوے ربوبیت یہی تھا۔ کہ وہ اپنی قوم کو کہتا تھا "کیا یہ بادشاہت میری نہیں اور کیا نہریں جو میرے پایہ تخت سے گزر رہی ہیں ۔ میری ملکیت نہیں ہیں"

قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۴۳/۸۱

اُس نے کہا اے میری قوم کیا ملکِ مصر ہمارا نہیں اور یہ نہریں جو ہمارے (ایوانِ شاہی کے) نیچے بہ رہی ہیں ۔ کیا تم نہیں دیکھتے؟

وہ اس بات کی طرف سے اندھا بنا رہا کہ اگر ہوائیں بخاراتِ آبی کو ہانک کر نہ لائیں اور بارش برسانا بند کر دیں یا سورج کی گرمی سے پودوں کو حیات نو نہ ملے اور شبنم ان کی پرورش چھوڑ دے تو کون ہے جو مردہ بستیوں میں جان ڈال سکے اور قسم قسم کے پھولوں اور خوشوں سے زمین کا دامن بھر سکے۔

وَ اللّٰهُ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۳۵/۹

اللہ وہ (قادرِ مطلق) ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر ہوائیں بادل کو اُبھارتی ہیں ۔ پھر ہم اُس کو ایسے شہر کی طرف لاتے ہیں ۔ جو (خشکی کی وجہ سے) مردہ پڑا ہوتا ہے ۔ اس طرح زمین کو اُس کی موت کے بعد زندہ کر دیتے ہیں ۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ
نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا
مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ
حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ
النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ
دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ
اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ
مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ
اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِهٖٓ اِذَآ
اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ؕ اِنَّ
فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ
یُّؤْمِنُوْنَ ۝ ۶/۹۹

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ
الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا
وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ
بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ
فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ

وہی قادرِ مطلق ہے جس نے آسمان سے
پانی برسایا اُس سے ہر قسم کی روئیدگی
پیدا کی اور اس سے ہری ہری
ٹہنیاں نکالیں اور اُن سے
گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور
کھجور کے گابھے سے گچھے جو لدے بوجھ
کے جھکے پڑتے ہیں اور انگور کے باغ اور
زیتون اور انار (ظاہر میں) ملتے جلتے ہیں
اور (ذائقہ کے لحاظ سے) مختلف ان میں سے
ہر ایک کا پھل اور پھل کا پکنا قابلِ دید ہے
بے شک جو لوگ خدا پہ ایمان
رکھتے ہیں۔ ان کے لیے اِن میں بہت
نشانیاں ہیں۔

اُس کی قدرت کی نشانیوں میں ایک
یہ بھی ہے کہ وہ تم کو ڈرانے اور اُمید
کرنے کے لیے بجلیاں دکھاتا ہے اور
آسمان سے پانی برساتا اور اس
کے ذریعہ زمین کو اُس کے مرے
پیچھے زندگی دیتا ہے۔ عقل والوں

یَعْقِلُوْنَ	کے لیے ان میں خدا کی قدرت کی بہت نشانیاں ہیں۔
۳۰/۲۴ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِى الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ۵ ۳۹/۲۱	کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا پھر زمین میں اس کے چشمے بہا لے اور اس کے ذریعہ رنگ برنگ کی کھیتی نکالتا ہے۔ پھر وہ زوروں پر آتی ہے۔ پھر وہ (پک کر) زرد اور آخر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے اس (ابتدا و انتہا) میں عقل مندوں کے لیے بڑی نصیحت ہے۔

ان تمام باتوں میں اہل ایمان کے لیے نشانیاں اور سبق ہیں جب حالت یہ ہے کہ پانی، ہوا، روشنی، گرمی غرضیکہ ہر ضروری چیز اللہ تعالیٰ نے مہیا کی اور اُسی نے پکنے وقت تک کھیتی کی حفاظت کی۔ تو اصل کسان کون ہے اللہ تعالیٰ یا انسان!

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۵ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۵ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ	بھلا دیکھو تو سہی کہ تمہاری کھیتی کو تم اگاتے ہو یا ہم، ہم چاہیں تو کوئی آفت بھیج کر (پکنے سے پہلے) اُسے ریزہ ریزہ کر دیں اور تم باتیں

تَفَکَّھُوْن ٥ ‏ ‏۵۶/۶۳-۶۵ بناتے رہ جاؤ۔

علامہ اقبال نے اِس حقیقت کو کیسی خوبی سے بیان کیا ہے ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب؟

کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟

کس نے بھردی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں! بالِ جبریل ۱۶۱

اللہ تعالیٰ کی یہ وسیع و عریض زمین انسان کو امانت کے طور پر سپرد کی گئی ہے ؎

اے کہ می گوئی متاعِ ما زماست ‏ ‏ مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو! ‏ ‏ چیست شرحِ آیۂ لَا تُفْسِدُوْا
کس امانت را بکارِ خود نبرد!
اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد ‏ ‏ جاوید نامہ ۱۳۵

وَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کی یہ اسلامی تعلیم فکر و نظر کا ایسا زبردست انقلاب پیدا کر دیتی ہے جو کسی اور نظام میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمین۔

ارمغانِ حجاز ۲۲۶

تاریخ گواہ ہے کہ فکر و نظر کے اس انقلاب نے اُن تمام مظالم کا خاتمہ کر دیا جو انسانی اقتدار کی وجہ سے محنت کرنے والے طبقہ پر ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جس ملک میں گئے۔ وہاں "زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ کاشتکار اور محنت کرنے والے مزدور آزادی کی سانس لینے لگے خاص حقوق رکھنے والے فرقے مٹ گئے اور ایک ہموار معاشرہ نے اس کی جگہ لے لی" (جسٹس امیر علی) اقبال نے ضربِ کلیم میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ مختلف وقتوں میں کئی فاتح آئے جنھوں نے اپنے اپنے نظام حکومت قائم کئے آخرکار سب فنا کے گھاٹ اتر گئے لیکن حقیقت اب تک باقی ہے ؎

کیا چرخِ کج رو، کیا مہر، کیا ماہ — سب راہرو ہیں وا ماندۂ راہ!
کڑکا سکندر بجلی کی مانند — تجھ کو خبر ہے اے مرگِ ناگاہ!
نادر نے لوٹی دلی کی دولت — اک ضربِ شمشیر! افسانہ کوتاہ!
افغان باقی ! کہسار باقی — الحکم للہ! الملک للہ!

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ! ضربِ کلیم ۱۶۸

اَلْاَرْضُ لِلّٰہ و الملک للہ کے مفہوم سے جہاں ایک طرف رزق کی طلب میں صرف اللہ تعالٰی سے التجا کی جاتی ہے اور اُسی کو رزاق کا

حقیقی سرچشمہ خیال کیا جاتا ہے۔ وہاں دوسری طرف یہی مفہوم مسلمان کی وطنیت کو بھی ہمہ گیری بخش دیتا ہے۔ وہ کسی ایک جگہ یا ملک کا پابند نہیں رہتا۔ اس کی ذات ایک سرزمین سے وابستہ ہو کر محدود نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس کے جہاں کی کوئی حد نہیں رہتی اور اس کا مقام ہر کہیں ہوتا ہے ؎

ہمت کو شناوری مبارک! پیدا نہیں بحر کا کنارہ
ہے سوزِ دروں سے زندگانی اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے!
مومن کا مقام ہر کہیں ہے! بال جبریل ۱۳۹

اقبال کے نظریہ کے مطابق وطن جب ایک جغرافیائی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جائے تو اسلام کے مخالف نہیں کیونکہ "قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں ہم سب ہندی (اب پاکستانی) ہیں اور ہندی (پاکستانی) کہلاتے ہیں کیونکہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں۔ جو ہند (پاکستان) کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ اس لحاظ سے اس کے حدود آج کچھ ہیں۔ اور کل کچھ کل تک اہل برما ہندوستانی تھے اور آج برمی ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافی نہیں بلکہ وطن، ایک اصول ہے، ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے

سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک
قانون ہے۔ اس لیے جب لفظ "وطن" کو ایک سیاسی تصور کے طور پر
استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے اور اسلام ہیئت
اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت
اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار
نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامعقول و
مردود ہے۔[1] اسی فرق کو ایک شعر میں بیان فرمایا ہے ؎

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے   بانگ درا ۱۷۳

وطنیت کے سیاسی تصور کو فروغ اٹھارویں صدی عیسوی میں شروع
ہوا اور موجودہ تمدن نے اس کو بہت تقویت دی انگلستان اور چند دیگر ممالک
کے بادشاہوں نے اس کو فروغ دینے میں بڑا حصہ لیا۔ آہستہ آہستہ دوسری قوموں
نے بھی اپنی تنظیم اسی بنا پر شروع کردی اس میں اُن کے لیے ایک بڑا فائدہ یہ
تھا کہ وہ اپنی معاشی قوت میں اضافہ کر سکتے تھے اور اپنی تاجرانہ ہوس پرستی
کو باحسن وجہ پورا کر سکتے تھے۔ اس طرح قوم نے اپنی علیحدہ تنظیم کا دعوے
کر کے اپنے قومی و سیاسی اقتدار کو فروغ دینا شروع کردیا۔

اسلامی ممالک میں اس نظریہ کی ترویج مغربی قوموں کے ذہن رسا کا نتیجہ
ہے جن کے پیش نظر خاص سیاسی مقاصد تھے۔ اس کے متعلق علامہ اقبال
نے ۱۹۳۸ء میں لکھا کہ "مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی

[1] حرف اقبال صفحہ ۲۵۰

سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔ شاید یورپ کے جدید نظریئے ان کے لیے جاذبِ نظر ہیں۔ مگر افسوس ؎

لوٗ نہ گردد کعبہ را رختِ حیات ۔۔۔ گر ز افرنگ آیدش لات و منات

اسی بنا پر مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں کہ قوم وطن سے بنتی ہے فرمایا ؎

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ ۔۔۔ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است ۔۔۔ چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ۔۔۔ اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

ارمغانِ حجاز ۲۷۸

اقبال نے مسلمانوں کو اس فریب سے خبردار کیا ہے ؎

از فریبِ عصرِ نو ہشیار باش ۔۔۔ رہ فتد اے راہرو ہشیار باش

رموز ۱۳۲

وہ وطنیت (اور قومیت) کے اس سیاسی تصور کو اسلام کے سراسر منافی خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسانی دماغ نت نئے نئے بت تراشتا رہتا

چنانچہ موجودہ وقت میں وطنیت کا بُت تیار کر کے انسانیت کو اس پر قربان کیا جا رہا ہے اور اس طرح انسان کا دوسرے انسان سے مصنوعی فرق قائم کیا جا رہا ہے ؎

فکر انسان بُت پرستے بُت گرے — ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آذری انداخت است — تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خون ریختن اندر طرب — نامِ اُو رنگ است وہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند
پیشِ پائے ایں بتِ نا ارجمند — رموز ۱۶۳

مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس بُت کو توڑ کر اسلام کی حقیقی روح کو بے نقاب کرے ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دینِ نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے بانگ درا ۱۶۰

قرآن میں خیر امۃ کی تعریف وطن کی فضیلت نہیں بتائی گئی۔ بلکہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو امت مسلمہ کے لیے وجہ امتیاز بنایا گیا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۳/۱۱۰

تم سب سے بہتر ہو کہ اچھے کام کرنے کے لیے کہتے اور برے کاموں سے منع کرتے اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

مسلمانوں کے حصار ملت کی بنا اتحاد وطن نہیں ہے ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے
بانگ درا ۱۴۲

اور نہ ہی اس کا جوہر کسی مقام سے وابستہ و مقید ہے ؎

جوہر ما با مقامے بستہ نیست بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست مرز بوم او بجز اسلام نیست
رموز ۱۴۹

تاریخ کے اوراق اُلٹئے تو آپ کو طارق بن زیاد کی شخصیت دکھائی دے

گی۔ جس نے اندلس کے کنارہ پر پہنچ کر اپنی تمام کشتیوں کو اس لئے آگ لگا دی کہ واپس جانے کا سوال ہی نہ رہے۔ حقیقت میں وہ اس طریق سے وطنیت کا اسلامی حل دنیا کے سامنے عملی رنگ میں پیش کر رہا تھا ؎

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت — گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم؟ — ترکِ سبب زروئے شریعت کجا رواست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر بُرد و گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست — پیامِ مشرق ۱۱۰

اگر مومن اس مقام کو کھو بیٹھے تو اُس کی حالت پر افسوس ہے ؎

مومناں را گفت آں سلطانِ دیں — 'مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمیں'
الاماں از گردشِ نہ آسماں — مسجدِ مومن بدستِ دیگراں

پس چہ باید کرد ۲۵

علامہ اقبال حب الوطنی کے جذبہ سے انکار نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ یہ "ایک طبعی صفت ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں اس کے لیے پوری جگہ ہے[1]۔ لیکن اصل اہمیت اُس کے ایمان، اُس کی تہذیب اور اُس کی روایات کو حاصل ہے اور میری نظر میں یہی اقدار اس قابل ہیں کہ انسان ان کے لیے زندہ رہے اور اُن ہی کے لیے مرے۔ نہ زمین کے اس ٹکڑہ کے لیے جس سے اس کی روح کو کچھ عارضی ربط پیدا ہو گیا ہے[2]۔"

---

[1] یہی وجہ ہے کہ اقبال کے بعد کے کلام میں بھی حب الوطنی کے جذبات جھلکتے رہتے ہیں مثال کے طور پر جاوید نامہ میں روح ہندوستان اور ضربِ کلیم میں شعاعِ امید۔

[2] خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ، ۱۹۳۰ء

سورج مشرق سے نکلتا ہے لیکن وہ صرف مشرق کو ہی روشن نہیں کرتا بلکہ مغرب کو بھی منور کرتا ہے۔ اسی طرح مسلمان کو وطن سے محبت ہونے کے باوجود اس کا جذبۂ وطنیت کسی وقت بھی اس کی عالمگیر اخوت کے رشتہ میں حائل نہیں ہوتا ؎

گرچہ از مشرق بر آید آفتاب — با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوزِ دروں — تا ز قیدِ شرق و غرب آید بروں
بر دمد از مشرقِ خود جلوہ مست — تا ہمہ آفاق را آرد بدست
فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روئے نسبت خاوری است — جاوید نامہ ۹۸

رمزِ مسلمانی اخوت کی جہانگیری میں ہے اور آدمیت کسی خاک سے وابستہ نہیں ؎

یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی — اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
بانگ درا ۳۰۸

ایک اور جگہ لکھا ہے ؎

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
بانگ درا ۳۱۲

یا

ہنوز از بندِ آب و گِل نہ رستی — تو گوئی رومی و افغانیم من

من اول آدم بے رنگ و بویم	ازاں پس ہندی و تورانیم من

پیام مشرق ۹۱

مسلمان کی زندگی کا دار و مدار حجاز و چین یا عرب و ایران پر نہیں۔ تمام مسلمان ایک ہی صبح خنداں کی شبنم کے مختلف قطرے اور ایک ہی گل کی بے شمار پتیاں ہیں جو خوشبو میں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ؎

ماکہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم	چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما	شبنمِ یک صبحِ خندانیم ما
مستِ چشمِ ساقیٔ بطحا ستیم	در جہاں مثلِ مے و مینا ستیم
چوں گلِ صد برگ مارا بو یکیست	اوست جانِ ایں نظام و او یکیست

اسرار ۱م

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے ہجرت مسلمان کو وطنیت کی زنجیر سے آزاد کرانے کا ایک عملی سبق ہے۔ پیغمبرِ اسلام کے لیے جغرافیائی وطن کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ آپ کا مقصد اشاعتِ حق تھا۔ اعدا کا یہ الزام کہ حضور دشمنوں کے خوف کی وجہ سے ہجرت پر مجبور ہوئے۔ غلط ہے۔ ہجرت مومن، کشمکشِ زندگی سے گریز یا فرار نہیں بلکہ عینِ زندگی ہے۔ البتہ حالات کو ناموافق دیکھ کر انسان غیر فطری زندگی کو قبول کرلے تو وہ حقیقت میں زندگی سے فرار اور بیکسی کے مترادف ہے۔ اس مسئلہ پر علامہ اقبال نے روشنی ڈالی ہے فرماتے ہیں ؎

عقدۂ قومیت مسلم کشود	از وطن آقائے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملّتِ گیتی نورد | بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش | لرزہ بر تن از شکوہِ فطرتش
پس چرا از مسکنِ آبا گریخت؟ | تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟
قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند | معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است | این ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنیٔ او از تنک آبی رم است
ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است ! رموز ۱۳۱

ویسے اسلامی نقطۂ نگاہ سے کسی ملک میں ایسا مغلوب اور بے بس ہو کر رہنا کہ دینِ الٰہی کی پیروی نہ ہو سکے یا جہاں انسانی محکومیت کی ایسی فضا پیدا ہو جائے جو پوری کوشش کے باوجود بھی سازگار نہ ہو سکے تو مسلمانوں کے لیے یہ واجب نہیں کہ وہ غیر فطری زندگی بسر کرنے پر قناعت کرے۔ خدا کی زمین وسیع ہے اور وہ ایسی جگہ ہجرت کر کے جا سکتے ہیں جہاں انہیں ایسی مجبوری نہ ہو:۔

قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ ۴/۹۷

وہ کہتے ہیں ہم کیا کرتے ہم ملک میں مغلوب اور بے بس تھے (اس پر فرشتے کہتے ہیں کہ اگر تم ملک میں مغلوب و بے بس تھے تو کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ کسی دوسری جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے ؟

مسلمانوں کے لیے دین کے مقابلہ میں وطن کی محبت جائز نہیں ؎

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی | دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
بانگِ درا ۱۷۲

اللہ کی راہ میں وطن چھوڑنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے کشائش کا وعدہ فرمایا ہے:۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّ سَعَةً ؕ

اور جو شخص اللہ کے راستہ میں وطن بار چھوڑ دے تو اس کے مقابلہ میں بہت جگہ اور کشادگی پائے گا۔

دیارِ مقامی سے آزاد ہو کر انسان عالم رنگ و بو کی تسخیر کر سکتا ہے ؎

صورت ماہی بہ بحر آباد شو ‌ ‌ ‌ یعنی از دیارِ مقام آزاد شو
ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد ‌ ‌ ‌ چوں فلک در شش جہت آباد شد
بوئے گل از ترکِ گل جولانگر است ‌ ‌ ‌ در فراخائے چمن خود گستر است

رموز ۱۴۲

اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ کے قرآنی مفہوم کو تسلیم کرنے سے ترکِ وطن کے ساتھ ہی قومیت کے اختلاف بھی مٹ جاتے ہیں ؎

تا وطن را شمعِ محفل ساختند ‌ ‌ ‌ نوعِ انساں را قبائل ساختند

رموز ۱۳۴

اسلام اور قومیت کے سوال پر مولانا حسین احمد مدنی کے بیان کے جواب میں علامہ مرحوم کی بحث ٹھوس دلائل سے بھری ہوئی ہے۔ اس ضمن میں آپ نے بحث کے لیے تین سوال پیش کیے ہیں جو ان کے اپنے الفاظ میں پورے جواب کے ساتھ من و عن پیش کیے جاتے ہیں:۔

۱۔ کیا مسلمان اولاً اجتماعی اعتبار سے واحد متحد اور معروف جماعت ہیں

جس کی اساس توحید اور ختمِ نبوت پر ہے یا کوئی ایسی جماعت ہے جو نسل
و ملک یا رنگ و بستان کے مقتضیات کے ماتحت اپنی ملی وحدت چھوڑ کر
کسی اور نظام و قانون کے ماتحت کوئی اور ہیئت اجتماعیہ بھی اختیار کر سکتے ہیں
"ثانیاً کیا ان معنوں میں بھی قرآن حکیم نے اپنی آیات کو کہیں لفظِ قوم
سے تعبیر کیا ہے یا صرف لفظِ ملت یا اُمت ہی سے پکارا گیا ہے۔
"ثالثاً اس ضمن میں وحی الٰہی کی دعوت کس لفظ کے ساتھ ہے کیا یہ کہیں
آیاتِ قرآنی میں آیا ہے کہ اے لوگو! یا اے مومنو! قوم مسلم میں شامل ہو جاؤ
اس کا اتباع کرو یا یہ دعوت صرف ملت کے اتباع اور اُمت میں شمولیت کی ہے
"جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ قرآن حکیم میں جہاں جہاں اتباع و شرکت کی
دعوت ہے وہاں صرف لفظ 'ملت' یا 'اُمت' وارد ہوتا ہے۔ کسی خاص 'قوم'
کے اتباع یا اس میں شرکت کی دعوت نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے :-

(۱) وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ ۴ / ۱۲۵	اور اس شخص سے دین میں بہتر کون ہے جس نے اپنا منہ اللہ کی طرف کیا اور نیکی کرنے والا اور ملت ابراہیم حنیف کی پیروی کرنے والا ہے۔
(۲) وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ ۱۲ / ۳۸	اور میں نے اپنے آباء ابراہیم کی ملت کی پیروی کی۔

اور یہ اتباع و اطاعت کی دعوت اس لیے ہے کہ 'ملت' نام ہے ایک دین
کا ایک شرع و منہاج کا، 'قوم' چونکہ کوئی شرع و دین نہیں۔ اس لیے ا

کی طرف دعوت اور اس سے تمسک کی ترغیب عبث تھی۔ کوئی گروہ ہو خواہ وہ قبیلہ کا ہو نسل کا ہو۔ ڈاکوؤں کا ہو۔ تاجروں کا ہو۔ ایک شہر والوں کا ہو۔ جغرافیائی اعتبار سے ایک ملک یا وطن والوں کا ہو۔ وہ محض گروہ ہے۔ رجال کا یا انسانوں کا۔ وحی الٰہی یا نبی کے نقطۂ خیال سے ابھی وہ گروہ ہدایت یافتہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ وحی یا نبی اُس گروہ میں آئے تو وہ اُس کا پہلا مخاطب ہوتا ہے اس لیے اس کی طرف منسوب بھی ہوتا ہے۔ مثلاً قوم نوحؑ۔ قوم موسےٰ، قوم لوط۔ لیکن اگر اسی گروہ کا مقتدا کوئی بادشاہ یا سردار ہو تو وہ اُس کی طرف بھی منسوب ہوگا۔ مثلاً قوم عاد، قوم فرعون اگر ایک ملک میں دو گروہ بن ہو جائیں اور اگر وہ متضاد قسم کے رہنماؤں کے گروہ ہوں تو وہ دونوں سے منسوب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جہاں قوم موسےٰ تھی۔ وہاں قوم فرعون بھی تھی۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ ۱۲۷/۷	قوم فرعون کے سرداروں نے کہا کہ کیا تو موسٰی اور اُس کی قوم کو چھوڑ دیتا ہے۔

لیکن ہر مقام پر جہاں قوم کہا گیا۔ وہاں نہ گروہ عبارت تھا۔ جو ابھی ہدایت یافتہ اور غیر ہدایت یافتہ سب افراد پر مشتمل تھا جو افراد پیغمبر کی متابعت میں آتے گئے۔ توحید تسلیم کرتے گئے وہ اُس پیغمبر کی ملت میں آگئے اُس کے دین میں آگئے یا واضح تر معنوں میں مسلم ہو گئے۔ یاد رہے کہ دین اور ملت کفار کی بھی ہو سکتی ہے۔

اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ	میں نے اُس قوم کی ملت کو چھوڑ دیا

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ ۱۲/۳۷ | ہے جو اللہ کے ساتھ ایمان نہیں لاتے

"ایک قوم کی ایک ملت یا اُس کا منہاج تو ہو سکتا ہے لیکن ملت کی قوم کہیں نہیں آیا ۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے قرآن میں ایسے افراد کو جو مختلف اقوام و ملل سے نکل کر ملت ابراہیمی میں داخل ہو گئے ۔ ان کو داخل ہونے کے بعد لفظ قوم سے تعبیر نہیں کیا ۔ بلکہ امت کے لفظ سے کیا ہے ۔

"ان گزارشات سے میرا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآن کریم میں مسلمانوں کے لیے امت کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں آیا ... قوم رجال کی جماعت کا نام ہے ۔ اور یہ جماعت بہ اعتبار قبیلہ ، نسل ، رنگ ، زبان وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے ۔ لیکن ملت سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی گویا ملت یا امت جاذب ہے اقوام کی ۔ خود اُن میں جذب نہیں ہو سکتی ۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیمؑ سب سے پہلے پیغمبر تھے ۔ جن کی وحی میں قوموں ۔ نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا ۔ بنی نوع آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی موحد و مشرک ۔ اس وقت سے لے کر دو ہی ملتیں دنیا میں ہیں ۔ تیسری کوئی ملت نہیں ۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوت ابراہیمی اور دعوت اسمٰعیلی سے غافل ہو گئے ۔ قوم اور قومیت کی ردا اوڑھنے والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دعا یاد نہ آئی جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت اُن دونوں پیغمبروں نے کی ۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ | جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیل خانہ کعبہ کی

مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص ۲/۱۲۷-۱۲۸

بنیادیں اٹھا رہے تھے (اور دعائیں مانگتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار ہم سے (یہ خدمت) قبول کر۔ بیشک تو ہی سننے جاننے والا ہے اور اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری نسل میں ایک امت پیدا کر جو تیری فرمانبردار ہو۔

کیا خدا کی بارگاہ سے "امت مسلمہ" کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ آپ کی ہیئت اجتماعی کا کوئی حصہ کسی عربی، ایرانی، افغانی، انگریزی، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا ہے۔ امت مسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ "الکفر ملۃ واحدۃ" کی ہے۔

"ایک اور لطیف نکتہ بھی مسلمانوں کے لیے قابل غور ہے۔ اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابل قدر تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقارب اور ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی؟ کیوں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو اپنا بنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔ اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین تو قریش مکہ کا بھی تھا۔ مگر افسوس آپ اس نکتہ پر غور نہیں فرماتے کہ پیغمبر خدا کے نزدیک اسلام دین قیم اور امت مسلمہ کی آزادی مقصود تھی۔ ان کو چھوڑ

کر یا ان کو کسی دوسری ہیئت اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی چاہنا بے معنی تھا۔ ابوجہل اور ابولہب امت مسلمہ کو ہی آزادی سے پھُولتا پھلتا نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بطور مدافعت اُن سے نزاع درپیش آتی۔ محمدؐ (فداہ امی و ابی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی اور آزاد تھی۔ لیکن جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ اُن کی قوم سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب ملّتِ مسلمہ یا ملّتِ محمدیہ بن گئے پہلے وہ ملک ونسب کے گرفتار تھے۔ اب ملک ونسب اُن کا گرفتار ہو گیا ؎

کسے کو پنجۂ زد ملک و نسب را — نہ داند نکتۂ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بودے محمد — نہ دادے دعوتِ دین بولہب را

"حضور رسالت مآب کے لیے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفار مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو۔ ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے۔ ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر حضور نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی۔ لیکن نبی آخر الزمانؐ کی راہ نہ ہوتی۔ نبوّت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانون الٰہی کے تابع ہو۔ جو نبوّت محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر یوں کہیئے۔ کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و

السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے اُن کو ان تمام آلودگیوں سے منزّہ کیا جائے۔ جو زبان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں۔ اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت اسے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقام محمدی۔ یہ ہے نصب العین ملت اسلامیہ کا۔

"انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزیوں کا۔ خونریزیوں کا اور محاذ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالم بشری میں ایک ایسی ملت قائم ہو سکتی ہے۔ جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسس ہو۔ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسب منشائے الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبر کا کرشمہ نہ سمجھئے۔ بلکہ یہ رحمۃ للعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوام بشری کو ان کے تمام خودساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو اُمتہ مسلمۃ لک کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شہداء علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آسکے۔"[1]

علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں افغانی کی زبان سے دین و وطن کے اسلامی نظریہ کی جو تشریح کی ہے وہ انہی خیالات کی آئینہ دار ہے ؎

لرد مغرب آں سراپا مکر و فن | اہل دیں را داد تعلیم وطن
او بفکر مرکز و تو در نفاق | بگذر از شام و فلسطین و عراق

---

[1] حرف اقبال، صفحہ ۲۵۰ تا ۲۶۱

تو اگر داری تمیز خوب و زشت	دل نہ بندی با کلوخ و سنگ و خشت
چیست دیں برخاستن از روئے خاک	تا ز خود آگاہ گردد جانِ پاک
می نگنجد آنکہ گفت اللہ ھُوْ	در حدودِ ایں نظامِ چار سُو
برگ از خاک و بر خیز و ز خاک	حیف اگر در خاک میرد جانِ پاک
گرچہ آدم بر دمید از آب و گِل	رنگ و نم چوں گُل کشید از آب و گِل
حیف اگر در آب و گِل غلطد مدام	حیف اگر برتر نپرّد زیں مقام
گفت تن در شو بخاکِ رہگذر	گفت جاں پہنائے عالم را نگر
جاں نگنجد در جہات اے ہوشمند	مردِ حُر بیگانہ از ہر قید و بند

حُر ز خاکِ تیرہ آید در خروش

زانکہ از بازاں نیاید کارِ موش! جاوید نامہ ۶۷

ملّت اسلامیہ کی جمعیت کا انحصار دین پر ہے ؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر	خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیّت کا ہے ملک و نسب پر انحصار	قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں	اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی

بانگِ درا ۲۷۹

ملّتِ اسلامیہ کی ہیئت شہد کی مانند ہے جس کا ایک قطرہ لالۂ حمرا کی رس کا مرہونِ منت ہوتا ہے اور دوسرا نرگس شہلا کا لیکن نہ ہی یہ کہتا ہے کہ میں نرگس سے ہوں اور نہ دوسرا یہ دعوے کرتا ہے کہ میں نیلوفری ہوں ؎

نکتۂ اے ہمدمِ فرزانہ بیں	شہد را در خانہ ہائے لانہ[1] بیں

[1] لانہ۔ شہد کا چھتہ۔

قطرۂ از لالۂ حمرا ستے   قطرۂ از نرگس شہلا ستے
ایں نمی گوید کہ من از عبہرم[1]   آں نمی گوید من از نیلوفرم

رموز ۱۸۸

ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے ایک خط میں علامہ اقبال نے لکھا کہ "اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے۔ نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ اسلام سائنس کا دشمن ہے۔ حقیقت میں نہ صرف اسلام کا بلکہ تمام انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے۔ جو لوگ بنی نوع انسان سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کریں"[2]

مسلمان کے لیے درسِ حیات یہ ہے ؎

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

بانگِ درا ۳۰۸

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

بانگِ درا ۳۱۲

---

[1] عبہر۔ نرگس [2] اقبال نامہ صفحہ ۴۶۸

اسلام نے نسلی و نسبی فضیلت کو مٹا کر انسانی اعمال کی برتری کو تسلیم کیا۔ کفر و ایمان اور مومن و غیر مومن کا امتیاز مسلکِ زندگی قرار پایا۔ مسلمان کو بتایا گیا کہ فرقِ مراتب صرف عمل سے ہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ ؕ ۴۹/۱۳	اللہ کے نزدیک تم میں بڑا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

مختلف قومیں اور قبیلے صرف اس لیے بنائے گئے تھے کہ وہ آپس میں پہچانے جا سکیں نہ اس لیے کہ ایک قبیلہ دوسرے پر اپنی فضیلت اور اپنی قومیت کی برتری کا دعویدار ہو۔ قرآن کریم میں ہے:۔

يٰأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ ۴۹/۱۳	لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری برادریاں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

سلمان فارسیؓ ایک آتشکدہ کے متولی کے بیٹے تھے۔ گھر سے نکل کر ملک شام میں گئے جہاں عیسائیت اختیار کی آخر مدینے میں پہنچے اور حضور رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ جب لوگوں نے ان کے حسب نسب کی بابت دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا "سلمان ابن اسلام"۔ اقبال تمام مسلمانوں کو ان کی تقلید کرنے کی تعلیم دیتا ہے ؎

فارغ از باب و ام و اعمام باش ہمچو سلمان زادۂ اسلام باش

مسلمان کے لیے ترکِ نسب ضروری ہے ؎

تو اے کودک منش خود را ادب کن　　مسلمان زادۂ ترکِ نسب کن
برنگِ احمر و خون و رگ و پوست　　عرب نازد اگر ترکِ عرب کن

پیامِ مشرق ۵۲

اگر اسلام میں حسب و نسب کی برتری ہوتی تو انبیاء کی اولاد کو غیر صالح عمل کرنے کے لیے عذاب نہ ملتا۔ قرآن حکیم نے طوفانِ نوح کا ذکر اسی عدیم النظیر حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اتنی تفصیل سے کیا ہے۔ اس مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں بھی کچھ تفصیل دی جاتی ہے۔ جب حضرت نوحؑ کی مخالفت میں قوم کی سرکشی اور تمرد انتہا کو پہنچ گئے اور وہ لوگوں کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ تو آپ نے خدا سے التجا کی کہ۔ نافرمان لوگوں کا نام و نشان صفحۂ زمین سے مٹا دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے ایک کشتی تیار کی اور ہر قسم کے جانوروں کے دو دو جوڑے کشتی میں لے لیے اور ان لوگوں کو بھی جو ایمان لا چکے تھے۔ اُس میں سوار کر لیا۔ قہرِ خداوندی پانی کی صورت میں آسمان سے برسا اور زمین سے بھی چشمے کھل گئے ستے اکہ ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ سرکش قوم کے وہ افراد جو ظلم و استبداد کی زندگی بسر کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ خس و خاشاک کی طرح بہنے لگے۔ طوفان بلا انگیز ہر طرف بپا تھا۔ جس کا ایک نظارہ یوں بیان فرمایا ہے:۔

وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي	اور کشتی ایسی موجوں میں کہ

مَوْجٍ كَالْجِبَالِ قف ۴۲/۱۱	پہاڑوں کی طرح اٹھتی ہیں ان کے ساتھ جارہی تھی۔

اس وقت حضرت نوح کا بیٹا جو کافروں کے ساتھ تھا۔سامنے آیا۔ حضرت نوح نے اس کو پکارا کہ کافروں سے الگ ہو جاؤ اور کشتی میں سوار ہو جاؤ۔لیکن اس نے جواب دیا" میں کسی پہاڑ پہ پناہ لے لوں گا۔وہ مجھے پانی کی زد سے بچالے گا" حضرت نوح نے بیٹے کی حماقت پر افسوس کیا اور اس کے انجام کو جانتے ہوئے خدا تعالیٰ سے عرض کی۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِىْ مِنْ اَهْلِىْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ۔ ۴۵/۱۱	اور نوح نے اپنے پروردگار سے دعا کی۔اس نے کہا۔خدایا۔میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے اور تجھ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا جواب چشم بصیرت کے لیے کافی ہے۔دیکھیں کہ کس طرح اپنوں وغیروں کے فرق کو رشتہ داری و قرابت سے نہیں بلکہ کفر و ایمان سے جانچا جاتا ہے۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ج اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ق فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ط	خدا نے فرمایا" اے نوح وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔وہ تو سراپا عمل غیر صالح ہے پس جس حقیقت کا تجھے علم نہیں اس بارے میں

اِنِّیْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ ۱۱	سوال نہ کر۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں سے نہ ہو جا"

اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ تعلقات کی بنیاد رشتہ داری یا قومیت پر نہیں بلکہ جذبہ ایمانی پر رکھی گئی۔ حضرت نوح کے بیٹے کو 'اہل' قرار نہ دیا گیا۔ اسی تقسیم کے ماتحت حضرت نوح و حضرت لوط کی بیویوں کو کفار میں شامل کیا گیا۔ حالانکہ قرآن کریم نے میاں اور بیوی کے رشتہ کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے لیکن جب ایمان کا رشتہ استوار نہ رہا اور ان کی بیویاں معیار خداوندی پہ پوری نہ اتریں تو اُن کی کوئی رعایت نہ کی گئی۔ اس کے برعکس قرآن کریم نے فرعون کی بیوی کی مثال دی ہے جس نے بارگاہِ الٰہی میں فرعون اور اس کے مظالم سے پناہ مانگی

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ○ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا	کافروں کے عبرت پکڑنے کیلئے خدا نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال دیتا ہے کہ یہ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں پھر ان دونوں نے ان کو دغا دی تو دونوں کے شوہر باوجودیکہ پیغمبر تھے) اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ کام نہ آئے اور انہیں حکم دیا گیا کہ دوسروں کے ساتھ تم بھی جہنم میں جا داخل ہو۔ اللہ (نے مسلمانوں (کی تسلی) کے لیے

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ	خدا ایک تو فرعون کی بیوی (آسیہ) کی مثال دیتا ہے کہ اس نے دعا کی کہ میرے پروردگار میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا اور مجھ کو فرعون اور اس کے کردار (بیجا) سے نجات دے اور نیز مجھ کو ان ظالم لوگوں سے نجات دے۔

۶۶/۱۱-۱۰

اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کے باپ کو غیروں میں شمار کیا گیا اور ان کی اولاد کے متعلق بھی ایسا ہی فیصلہ کیا گیا۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۔	اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان میں پورا اتر گیا تو فرمایا کہ میں تجھے انسانوں کا امام بناتا ہوں اس نے عرض کیا اور میری اولاد کے متعلق کیا حکم ہے (جواب دیا ان میں) جو ظالم ہوں گے انہیں میرا عہد نہیں پہنچتا۔

۲/۱۲۴

یہی اصول رسول اکرمؐ نے نوع انسان کی تقسیم کے لیے اختیار کیے۔ سارے دنیا کے مومن باوجود اختلاف رنگ و زبان اوطن، باحسب نسب کے بھائی

قرار دیے گئے۔ اور تمام دنیا کے منکر فریق مخالف میں رکھے گئے۔ ان دونوں جماعتوں کے درمیان وطن، زبان، رنگ اور قوم کا اشتراک قبول نہ کیا گیا۔ عملی طور پر تمام دنیا نے اپنے ایمان پر ہر قسم کے نسبی تعلقات کو قربان کر دیا۔ اور سنت ابراہیمی کے اتباع میں اپنے عزیزوں کو بھی کہا کہ ہم تم سے تعلق نہیں رکھ سکتے۔

حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ ۚ	تا آنکہ خدائے واحد پر ایمان نہ لائیں ۔

ملت ما شان ابراہیمی است   شہد ما ایمان ابراہیمی است
گر نسب را جزو ملت کردۂ   رخنہ در کار اخوت کردۂ
در زمین ما نگیرد ریشہ ات
ہست نا مسلم ہنوز اندیشہ ات   رموز ۱۸۹

اللہ تعالےٰ نے اعمال کی باز پرس میں پیغمبروں کو بھی مستثنےٰ قرار نہیں دیا۔

فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ	ہم یقیناً اُن لوگوں سے دریافت کریں گے جن کے پاس ہمارا پیغمبر بھیجا گیا تھا اور ہم پیغمبروں سے بھی دریافت کریں گے ۔

آنحضرتؐ کا حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد بھی اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔

لَيْسَ لِلْعَرَبِيِّ فَضْلٌ	کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے۔ تمام

عَلَی الْعَجَمِیِّ کُلُّکُمْ   تمام آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے
اَبْنَاءُ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنَ التُّرَابِ   بنے تھے ۔

جب دل محبوب حجازی سے وابستہ ہو جائے تو روم و عرب اور ملک و نسب کے سب امتیاز مٹ جاتے ہیں ؎

نیست از روم و عرب پیوند ما   نیست پابند نسب پیوند ما
دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم   زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم
رشتۂ ما یک تولایش بس است   چشم ما را کیف صہبایش بس است

رموز ۱۹۰

مسلمان کا ایمان لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ پر ہے - یعنی اس کا خدا خون اور رشتہ کے تعلق سے بالاتر ہے - نسب اور نسل کی برتری کوئی اہمیت نہیں رکھتی - جو لوگ رنگ و خون کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں - وہ حقیقت میں لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کے مطلب سے بے خبر ہیں ؎

ہر کہ پا در بند اقلیم و جد است
بے خبر از لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ است   رموز ۱۹۰

ہندوستانی سیاست میں غیر مسلموں کا اسی قسم کی فضیلت کا ہی جذبہ تھا جس کے ذریعہ وہ تعداد کے بل بوتے پر مسلمانوں پر حکومت کرنے کی خواہش رکھتے تھے - اسی جذبہ کی نفی علامہ اقبال کے نظریہ پاکستان کی موجب ہوئی - اسلام کی وحدت کو صوبائی اور ریاستی بندھنوں میں جکڑ کر پارہ پارہ کرنا اُن کا منتہائے نظر تھا جو اسلامی روایات کے بھی بالکل مخالف تھا - قوم پرست ہندو اور ا...

سیاست قومیت کے نام پر ایک ایسا مرکز قائم کرنا چاہتے تھے۔ جو انھیں دوسری ملتوں پر ہمیشہ کے لیے غلبہ دے سکتے۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اپنے خطبہ صدارت میں نہایت اہم خیالات کا اظہار فرمایا اور ہندوستان میں ایک اسلامی ہندوستان کے قیام کو حق بجانب ثابت کیا۔ آپ کے الفاظ ہیں کہ "میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے۔ خواہ اس کے باہر مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔"[1]

آج ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ مرحوم کے اس خیال کی عملی صورت قیام پاکستان میں موجود ہے۔ جس کا انحصار علامہ کے خیال کے مطابق "ایک اخلاقی نصب العین پر ہے۔ جس کا عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں۔ بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے۔ جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔" عوام کو وطن و قوم کا نام لے کر ابھارنے اور مملکت کو پختہ کرنے کا کام جدید وقتوں میں سب سے زیادہ نازی اور فسطائی حکومتوں نے کیا ہے

---

[1] اقبال صفحہ ۳۱

لیکن اس کا نتیجہ ہولناک تباہی کی صورت میں دنیا کے سامنے ہے۔ اس طریق سے قومیں بنتی ہیں لیکن آدمیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے ؎

آں چناں قطع اخوت کردہ اند | بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
تا وطن را شمع محفل ساختند | نوعِ انساں را قبائل ساختند
جنتے جستند در بئس القرار | تا اَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَار

اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ	اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں جا اُتارا

آیہ شریفہ یوں ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۙ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۔ ۱۴ / ۲۸-۲۹	کیا تم نے اُن لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جنھوں نے اللہ کی نعمت کے بدلے میں ناشکری کی اور آخر کار اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر جہنم میں لے جا اُتارا کہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

ایں شجر جنت ز عالم بردہ است | تلخئ پیکار بار آوردہ است
مردمی اندر جہاں افسانہ شد | آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند | آدمیت گم شد و اقوام ماند

رموز ۱۳۳

؎ بسلہ. خلقۃ ۱۰ - ۱۰ ٹھکانہ۔

اور پھر اس پر لطف یہ ہے کہ ایسے ملک باوجود ایک قوم ہونے کے بھی بعض اوقات ایک دوسرے کے ساتھ متفق نہیں ہو سکتے۔

أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ — یا تم کو گروہ گروہ کر کے لڑا دے اور
يُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ — تم میں سے بعض کو بعض کی لڑائی
بَعْضٍ ؕ ۶/۶۵ — کا مزہ چکھائے۔

۱۹۳۸ء میں سال نو کا پیغام نشر کرتے ہوئے علامہ مرحوم نے ہسپانیہ کے باشندوں کی مثال پیش کی اور فرمایا کہ وہ ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں۔ اس ایک واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے۔ اور وہ رنگ۔ نسل اور زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام و نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا۔ جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا۔ جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے امتیازات کو نہ مٹایا جائے گا۔ اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔[۱]

اس فتنہ کی تفصیل جاوید نامہ میں یوں دی ہے ؎

[۱] حرف اقبال صفحہ ۲۴۷

سرگذشت آدم اندر شرق و غرب | بہر خاکے فتنہ ہائے حرب و ضرب
یک عروس و شوہر او ما ہمہ | آں فسوں گر بے ہمہ ہم با ہمہ
عشوہ ہائے او ہمہ مکر و فن است | نے از آنِ تو نہ از آنِ من است
در نسازد با تو ایں سنگ و حجر | ایں ز اسبابِ حضر تو در سفر
اختلاطِ خفتہ و بیدار چیست؟ | ثابتے را کار با سیار چیست؟
حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت | ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر

رزق و گور از وے بگیر او را مگیر جاوید نامہ ۸۰

یہ امر بالکل واضح ہوگیا ہے کہ اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کے قرآنی مفہوم کے مطابق دین و اعمال ہی اصلی بنا ہے اور وطنیت و قومیت کی حیثیت بالکل ثانوی رہ جاتی ہے۔ اس اخلاقی نصب العین کے پابند تمام افراد کو متحد درجہ عطا کرنے کے لیے ارشاد فرمایا۔

کُلُّ مومن اِخْوَۃٌ تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

علامہ اقبال نے ایسی ملت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے ؎

کُلُّ مؤمن اِخوۃٌ اندر دلش | حریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیبِ امتیازات آمدہ | در نہاد او مساوات آمدہ
ہم چو سرو آزاد فرزندان او | پختہ از قالوا بلیٰ پیمانِ او
سجدۂ حق گل بیمائش زدہ | ماہ و انجم بوسہ بہ پایش زدہ!

رموز ۱۷۱

دولت و مرتبہ کے اس فرق کو جو زمانۂ جاہلیت میں حد سے بڑھ چکا تھا عملی طور پر نماز میں بالکل مٹا دیا گیا۔ دن میں پانچ بار امیر و غریب اور محتاج و غنی سب کو ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر اپنے رب اور مالک کے سامنے سربسجود ہونے کا حکم دیا ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

بانگ درا ۱۸۰

خطبات میں علامہ اقبال نماز کے عملی نتائج پر بحث کرتے ہوئے تصور کو دعوت دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "اگر جنوبی ہند کے مغرور برہمن کو روزانہ اچھوتوں کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا ہونا پڑے، تو قدرتی طور پر تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے اندر ایک عظیم تبدیلی رونما ہو جائے گی اور اس کا جذبہ نفرت آہستہ آہستہ خود بخود مٹ جائے گا۔"

ہجرت کے پہلے سال میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آنے کے چند ماہ بعد ہی ایک دستاویز مرتب فرمائی جو ابن اسحاق اور ابو عبیدہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے۔ یہ نہایت اہم دستور العمل تھا۔ جو حکم کی صورت میں نافذ کیا گیا۔ اس میں ایک فقرے کی رو سے مسلمانوں کے ادنیٰ ترین فرد کو بھی اختیار دیا گیا کہ وہ کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر دے۔ کیونکہ

دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں ایمان والے باہم بھائی بھائی ہیں ۔ اس فقرہ نے اخوت و مساوات اور آزادیٔ عمل کو سیاسی میدان میں بھی عملی طور پہ جاری کر دیا ۔ اس کی مثال تاریخ میں بھی موجود ہے ۔ جب ایرانیوں سے جنگ کے موقعہ پر ایرانی سپہ سالار جابان ایک مسلمان سپاہی کے ہاتھوں گرفتار ہوا ۔ اُس نے اپنا مرتبہ ظاہر نہ کیا اور امان طلب کی ۔ مسلمان سپاہی نے اُسے امان دے دی ۔ بعد میں جب اُس کی شخصیت معلوم ہوئی تو مسلمانوں نے اُس دشمنِ اسلام کے قتل کا مطالبہ کیا اُس پر اسلامی سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ نے فیصلہ کیا کہ اُس سپاہی کے عہد کی پابندی سب پر لازم ہے ؎

گفت اے یاراں مسلمانیم ما — تارِ چنگیم و یک آہنگیم ما
نعرۂ حیدرؓ نوائے بوذر است — گرچہ از حلقِ بلالؓ و قنبرؓ است
ہر یکے از ما امینِ ملت است — صلح و کینش صلح و کینِ ملت است
ملت ار گردد اساسِ جانِ فرد — عہدِ ملت می شود پیمانِ فرد
گرچہ جاباں دشمنِ ما بودہ است — مسلمے او را اماں بخشودہ است
خونِ او اے معشرِ خیر الانام
بر دمِ تیغِ مسلماناں حرام — رموز ۱۴۲

اُسی دستور العمل کے ایک اور فقرے کی رو سے رسول اکرم نے حق و انصاف کے معاملہ میں جانبداری کرنے بلکہ اپنے حقیقی بیٹے کو بھی ناجائز طور پر بچانے کی سعی سے باز رہنے کی تاکید فرمائی اور حکم دیا کہ قصور وار کو سزا

دلانے کے لیے ہر مسلمان پوری کوشش کرے۔ شاہ ہو یا گدا ہر شخص مساوی طور پر شریعت کا پابند اور اس قانون کے سامنے جواب دہ ہے۔

علامہ اقبال نے ایک واقعہ سلطان مراد شاہ خجند کا ذکر کیا ہے جس نے ایک معمار کا ہاتھ اس لیے کاٹ دیا تھا کہ اس کی تعمیر کردہ مسجد بادشاہ کو پسند نہ آئی۔ معمار نے اپنا مقدمہ قاضی کے ہاں اس بنا پر دائر کر دیا کہ

خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست

قرآن کا قانون بادشاہ سے کوئی رعایت نہیں رکھتا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ ۲/۱۷۹	اور تمہارے واسطے قصاص میں زندگی ہے۔

حکم ہوتا ہے کہ ہاتھ کے بدلے ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

یافت موری بر سلیمانے ظفر   سطوتِ آئینِ پیغمبر نگر
پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است   بوریا و مسندِ دیبا یکے است

لیکن معمار خود سلطان کا قصور معاف کر دیتا ہے کیونکہ

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ۔ ۱۶/۹۰	اللہ انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

نفسِ مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر پوری نظم درج ذیل ہے ؎

بود معمارے ز اقلیم خجند   در فنِ تعمیر نام او بلند
ساخت آں صنعت گر فرہاد زاد   مسجدے از حکم سلطان مراد
خوش نیامد شاہ را تعمیر او   خشمگیں گردید از تقصیر او

آتشِ سوزندہ از چشمش چکید — دستِ آں بیچارہ از خنجر برید
جوئے خوں از ساعدِ معمار رفت — پیشِ قاضی ناتوان و زار رفت
آں ہنرمندے کہ دستش سنگ سفت — داستانِ جورِ سلطاں باز گفت
گفت اے پیغامِ حق گفتارِ تو — حفظِ آئینِ محمدؐ کارِ تو
مفتہ گوشِ سطوتِ شاہاں نیم — قطع کن از روئے قرآں دعویم
قاضیٔ عادل بدنداں خستہ لب — کرد شہ را در حضورِ خود طلب
رنگِ شہ از ہیبتِ قرآں پرید — پیشِ قاضی چوں خطاکاراں رسید
از خجالت دیدہ برپا دوختہ — عارضِ او لالہ‌ہا اندوختہ
یک طرف فریادیٔ دعوے گرے — یک طرف شاہنشہ گردوں فرے
گفت شہ از کردہ خجلت بردہ ام — اعتراف از جرمِ خود آوردہ ام
گفت قاضی فی القصاص آمد حیات — زندگی گیرد بایں قانون ثبات
عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست — خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست
چوں مراد ایں آیۂ محکم شنید — دستِ خویش از آستیں بیروں کشید
مدعی را تابِ خاموشی نماند — آیۂ بالعدل والاحسان خواند
گفت از بہرِ خدا بخشیدمش — از برائے مصطفےٰ بخشیدمش
یافت مورے بر سلیمانے ظفر — سطوتِ آئینِ پیغمبر نگر

پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسندِ دیبا یکے است — رموز ۱۴۳

عدل کے معاملہ میں رسولِ اکرم نے کبھی کسی کو قبیلہ کی فوقیت کی

وجہ سے رعایت نہیں کی۔ ایک دفعہ قبیلہ مخزوم کی ایک خاتون نے چوری کی۔ معزز قبیلہ کی فرد ہونے کی وجہ سے تمام لوگ اس بات کے خواہشمند تھے۔ کہ اُس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ چنانچہ سب نے اسامہ بن زیدؓ کو حضور کے پاس سفارش کے لیے بھیجا۔ آپ نے اسامہ کو فرمایا کہ "حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو؟ بنی اسرائیل اسی لیے ہلاک ہوئے کہ اُن میں بڑے لوگوں کو جرم کی سزا نہ ملتی تھی لیکن معمولی لوگوں سے کوئی رعایت روا نہ رکھی جاتی تھی۔ اسامہ قسم ہے۔ اُس ذات کی۔ جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کی مرتکب ہو تو میں اُس کا بھی ہاتھ کاٹنے سے دریغ نہ کروں" یہ ہے رسول کا عدل اور اس کی تعلیم اخوت و مساوات لیکن کج فطرت کو یہ مساوات ایک آنکھ نہیں بھائی۔ ابوجہل کا سینہ اسی مساوات کی وجہ سے داغ داغ رہا۔ علامہ اقبال کی زبانی اُس کی رُوح کا نوحہ سنیں ؎

سینۂ ما از محمد داغ داغ	از دم او کعبہ را گل شد چراغ
مذہب او قاطع ملک و نسب	از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست	با غلامِ خویش بر یک خوان نشست
احمراں با اسوداں آمیختند	آبروئے دودمانے ریختند
ابنِ عبداللہ فریبش خوردہ است	رستخیزے بر عرب آوردہ است

جاوید نامہ ۵۹

لیکن مومن اسی مساوات میں اپنے لیے سرمایۂ حیات ڈھونڈتا ہے

اس کے لیے مساوات عقیدہ توحید کا عملی پہلو ہے اور اس لیے اُسے میں کوئی غیر معمولی بات معلوم نہیں ہوتی ؎

اسود از توحید احمر می شود　　خویش فاروقؓ و ابوذرؓ می شود

رموز　۱۰۶

اس نظام میں حضرت بلالؓ کی شخصیت اس بات کا ثبوت مہیا کرنے کے لیے کافی ہے کہ ایک حبشی کو کس طرح دوام نصیب ہوتا ہے ؎

لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے　　اہل قلم میں جس کا بہت احترام تھا
جولانگہ سکندرِ رومی تھا ایشیا　　گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا
دنیا کے اس شہنشہِ انجم سپاہ کو　　حیرت سے دیکھتا فلکِ نیل فام تھا
آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں
تاریخ دان بھی اُسے پہچانتا نہیں
لیکن بلالؓ، وہ حبشی زادۂ حقیر　　فطرت تھی جس کی نورِ نبوّت سے مستنیر
جس کا امیں ازل سے ہُوا سینۂ بلالؓ　　محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط　　کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز　　صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوش چرخ پیر
اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے؟
رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے　　بانگ درا ۲۷۲

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بیشمار تاریخی واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن جبلہ بن الایہم کا واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم ہے۔ کیونکہ

یہاں کج فطرت واقعات کے لباس میں صاف منعکس ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں جبلّہ (جو غسان کا عیسائی شہزادہ تھا) مسلمان ہو گیا۔ حج کے زمانہ میں طواف کے وقت کسی غریب بدوی کا پاؤں جبلّہ کے لبے چوغہ پر پڑ گیا۔ نو مسلم تاجدار اس کو برداشت نہ کر سکا اور غصّہ سے بدوی کو طمانچہ مارا۔ مقدمہ حضرت عمرؓ کے پاس پیش ہوا تو آپ نے قصاص کے لیے فرمایا جبلّہ کو ایک معمولی شخص کے مقابلہ میں قصاص دینا ناگوار گزرا تو خلیفہ وقت نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کے قانونِ عدل میں انسانیت کے لحاظ سے رعایا اور بادشاہ سب مساوی ہیں۔ فضیلت صرف نیک اعمال اور عمدہ اخلاق کو حاصل ہے جبلّہ اسے برداشت نہ کر سکا اور بھاگ کر چلا گیا۔ اور پھر عیسائی ہو گیا۔

لیکن اسلامی نظام ان واقعات کی پروا نہیں کرتا اور نہ ہی ان سے متزلزل ہوتا ہے۔ یہ اسلامی اصول ہی تھے کہ آنحضرت صلعم نے اسامہ بن زید کو غلام زادہ ہونے کے باوجود امیر لشکر مقرر فرمایا۔ ابھی لشکر روانہ نہ ہوا تھا کہ آنحضرتؐ کا انتقال ہو گیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ منتخب ہوئے اسلامی اصول کی ہمہ گیری پھر دیکھنے میں آئی جب لشکر روانہ ہوا اور اسامہ سب سے آگے گھوڑے پر سوار جا رہے تھے اور خلیفہ اسلام اُن کے گھوڑے کے ساتھ چالیس قدم تک پیدل الوداع کہنے کے لیے گئے۔

یہی اصول تھے جن کے ماتحت حضرت عمر فاروقؓ بیت المقدس کے سفر میں اپنے غلام کے ساتھ باری باری اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ اتفاق سے جس وقت امیر المومنین شہر کے دروازے پر پہنچے تو غلام اونٹ پر سوار تھا۔

اور آپ نے نکیل پکڑ رکھی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر عیسائیوں کو یقین ہو گیا کہ یہ قوم بلا شبہ ساری دنیا کو فتح کرنے کی قوت رکھتی ہے۔

یہی جذبہ اُس مردِ مسلمان مغیرہ کے دل میں کارفرما تھا جس کو رستم سالار ایران نے شاہی دربار کی شان و شوکت دکھا کر مرعوب کرنا چاہا۔ لیکن وہ بانات و قالین کے فرش سے گزرتا، دو رویہ ننگی تلواروں کے بیچ میں سے بلا خوف زرنگار تخت پر جا کر بیٹھ رہا۔ وجہ دریافت کرنے پر اسلامی مساوات کے زریں اصول کو ان سنہری الفاظ میں بیان کیا کہ ہم میں یہ دستور نہیں کہ ایک آدمی خدا بن کر بیٹھ جائے اور باقی اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں اور غلاموں کی طرح سجدہ کریں[1]۔

یہ عالمگیر اخوت مسلمانوں کے امۃ واحدہ ہونے اور ایک ہی مرکز پر مشترک ہونے کی زبردست دلیل ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک خدا پر ایمان نے مسلمانوں کو روزِ اوّل سے ہی ایک امت میں منسلک کر دیا تھا جن کی آنکھیں جدا لیکن نگاہ ایک ہوتی ہے ؎

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ؟	با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
اہلِ حق را حجت و دعوےٰ یکے است	خیمہ ہائے ما جدا دلہا یکے است
ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب	یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب
یک نگاہی را بچشم کم مبیں	از تجلی ہائے توحید است ایں

جاوید نامہ ۲۲۷

[1] یہ واقعہ غزوہ بویب کے موقعہ پر ۱۵ھ میں ہوا۔

اسلام کے لیے وحدت، بنیادی حیثیت رکھتی ہے اس لیے سیاسی طور پر بھی اس کو قیام ہجرت کے پہلے ہی سال عمل میں لایا گیا۔ جب کہ آنحضرت صلعم نے وہ اہم دستور مرتب فرمایا۔ جس کا ذکر پہلے ہوا۔ اُس دستور کے پہلے فقرے یہ تھے:۔

(۱) یہ ایک حکمنامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمدؐ کا۔

قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور اُن لوگوں کے مابین جو اُن کے تابع ہوں اور اُن کے ساتھ شامل ہو جائیں اور اُن کے ہمراہ جنگ میں بھی حصّہ لیں۔

۲۔ دوسرے تمام لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت ہوگی۔

سیاسی وحدت کے قیام کے بعد یہ بھی ضروری تھا کہ اسے اندرونی اختلافات کے مقابلہ میں محفوظ کیا جائے اور ایسے اختلافات کے باوجود اسے قائم رکھا جائے۔ چنانچہ نقرہ ۲۳ میں حکم دیا کہ "جب کبھی تم میں کسی امر پر اختلاف ہو تو خدا اور محمدؐ کی طرف رجوع کرو۔" جب تک مسلمان اس مشعلِ ہدایت کی روشنی میں چلتے رہیں گے۔ انہیں کسی قسم کا ڈر اور خوف نہیں ہوگا ؎

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفٰےؐ رو: ارمغانِ حجاز ۸۹

لہ دستور کے اردو ترجمہ کے لیے "اسلام کے سیاسی تصورات"۔
غلام دستگیر رشید۔ صفحہ ۲۰۷ تا ۲۱۴

سیاسی وحدت کو مزید تقویت دینے کے لیے حج اور زکوٰۃ کے احکام خداوندی پر زور دیا گیا۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کا مرکز کعبہ قرار دیا گیا اور سب کے لیے حج کا ایک ہی وقت اور ایک ہی زبان میں عبادت کا حکم دے کر ایسا مرکز قائم کیا جو دنیا میں اسلام کے سوا اور کسی نظام میں نہیں مل سکتا۔ اس مرکز کی تعریف یہ ہے :-

لِلنَّاسِ سَوَآءً اِلْعَاکِفُ فِیْهِ وَ الْبَادِ ؕ ۲۲/۲۵	(بلا امتیاز) سب آدمیوں کے لیے خواہ وہاں کے رہنے والے ہوں باہر کے۔

مسلمانوں کے اس اجتماع میں قومی و نسلی امتیاز مٹ جاتے ہیں۔ امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ، عالم اور جاہل مختلف زبانیں بولنے والے ایک ہی لباس میں ملبوس ہو کر بارگاہ خداوندی میں حاضر ہو کر رحمت الٰہی کے طالب ہوتے ہیں۔ وطن کا جغرافیائی تصور اپنا سر نہیں اٹھا سکتا۔ غرضیکہ مومن کی اصل فطرت یہاں خوب ہی نمایاں ہوتی ہے ؎

مومناں را فطرت افروز است حج
ہجرت آموز و وطن سوز است حج — اسرار ۴۸

حج کے موقعہ پر مسلمان اپنے اجتماعی مسائل پر بھی تبادلہ خیال کر سکتے ہیں اور اس طرح بین الاقوامی سوالات کا حل آسان ہو جاتا ہے۔ دراصل باہمی تعاون و ہمدردی کے ذرائع سوچ کر وہ ایک وجود واحد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ؎

قوم را مرکز چو جاں در پیکر است — خط او در نقطۂ او مضمر است
قوم را ربط و نظام از مرکزے — روزگارش را دوام از مرکزے

راز دار و راز ما بیت الحرام
سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام رموز ۱۵۶

حج مختارہ اسلامی قوت کا ایسا ذریعہ ہے جو تمام دُنیا کی بین الاقوامی مجالس اور لیگ آف نیشنز سے بڑھ چڑھ کر ہے یہاں امت مسلمہ کی تعمیر اور تنظیم کا کام ایسی آسانی و یک جہتی سے ہو سکتا ہے جو کسی مجلس میں ممکن نہیں ؎

ملت بیضا ز طوفش ہم نفس ہمچو صبح آفتاب اندر تفس
توز پیوند حریمے زندۂ تا طواف او کنی پایندۂ

رموز ۱۵۷

ہندی مسلمانوں کی سیاسی جد و جہد میں علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں ایک مرکز کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ "کسی سیاسی طرزِ عمل کے لیے آزادانہ جد و جہد کرنا اُسی وقت ممکن ہو سکتا ہے۔ جب پوری قوم اس پر آمادہ ہو اور ان کے تمام عزائم اور ارادے ایک ہی مقصد پر مرکوز ہو جائیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم لوگوں کے اندر بھی وہ اشتراک عزم پیدا ہو جائے جس کا از خود نشو و نما ہوتا ہے؟ فرقہ بندی کی ہوس اور نفسانیت کی قیود سے آزاد ہو جائیے اور پھر اس نصب العین کی روشنی میں جو آپ کی طرف منسوب ہے۔ اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجئے۔

"ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے یہ ہے کہ یہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں

تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائیں گی۔ آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔ قرآن مجید کی ایک نہایت معنی خیز آیت یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ایک پوری ملت کی موت و حیات کا سوال ایسا ہی ہے۔ جیسے ایک نفس واحد کا۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم مسلمان جو بجا طور پر یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ یہ ہم ہی تھے۔ جو سب سے پہلے انسانیت کے اس بلند اور ارفع تصور پر عمل پیرا ہوئے۔ ایک نفس واحد کی طرح زندہ رہیں"۔ [۱]

قائدِ اعظم کا حصولِ پاکستان اس نظریہ کی ایک ٹھوس دلیل ہے اور مسلمانانِ پاکستان کے سامنے یہی نصب العین پھر بھی موجود ہے ؎

مردہ ؟ از یک نگاہی زندہ شو ۔ بگذر از بے مرکزی پایندہ شو
وحدتِ افکار و کردار آفریں
تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں! ۔ جاوید نامہ ۲۲۸

یہودیوں کی گذشتہ تاریخ میں ہمارے لیے سبق ہے۔ قوانینِ الٰہیہ کے مرکز کو چھوڑنے کی وجہ سے دنیا کی دولتمند قوم ہونے کے باوجود روئے زمین پر ہر جگہ اُنہیں دھتکارا گیا۔ اور یہ جس جگہ بھی گئے اللہ کی زمین اُن پر تنگ ہو گئی [۲]

[۱] حرف اقبال صفحہ ۵۰ [۲] یہودیوں نے مختلف وقتوں میں پیغمبروں کو جھٹلایا۔ بلکہ اُن کو قتل تک کر ڈالا۔ ہر نبی کی تکذیب میں کوشاں رہے۔ وہ حضرت مریمؑ پر تہمت رکھتے تھے حضرت لوطؑ پر بدکاری کا الزام لگاتے تھے اور حضرت سلیمانؑ کو عملیات وغیرہ نعوذ باللہ کا موجد سمجھتے تھے سنہ ء میں نیرو کے ایک جرنیل نے یروشلم کو تباہ کیا ہیکل کو جلا دیا اور یہودی سلطنت کا بُری طرح خاتمہ ہوا اور وہ مَلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثُقِفُوا کا مصداق ہو گئے۔ قرآن کریم میں سورۂ بقر اور آلِ عمران میں یہودیوں کے عیوب کا ذکر کیا گیا ہے جن میں بڑے (باقی اگلے صفحہ)

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْآ ۳/۱۱۱ — جہاں کہیں بھی جائیں اُن پر ذلّت کی مار ہے۔

علامہ اقبال نے لکھا ہے ؎

عبرتے اے مسلم روشن ضمیر — از مآل اُمّتِ موسیٰ بگیر
داد چوں آں قوم مرکز را ز دست — رشتۂ جمعیّتِ ملّت شکست
رفت نم از ریشہ ہائے تاکِ اُو
بیدِ مجنوں ہم نزدید خاکِ اُو — رموز ۱۵۸

ایک مرکز قائم کرنے کے لیے مغربی اقوام بھی بین الاقوامیت کے سُر الاپتی رہتی ہیں اور مختلف وقتوں میں اس کو مؤثر بنانے کی تدابیر بھی اختیار کی گئی ہیں۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد مجلسِ اقوام بنائی گئی لیکن چونکہ اُس میں اسلامی مرکز کی یک جہتی نہ تھی۔ بلکہ ذاتی اغراض اور جوع الارض کی وہی آرزوئیں مضمر تھیں جن کا علاج کرنا مقصود تھا۔ اس لیے یہ ادارہ کفن چوروں کی انجمن بن کر رہ گیا اور ممبران کا منتہائے نظر آپس میں قبور کی تقسیم ٹھیرا ؎

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۴) بڑے یہ ہیں :-

مشرکانہ بُت پرستی منزد، احکام الٰہی میں تصرف اور معانی میں اپنے مطلب کے مطابق تاویل۔ مال و دولت کی حرص و طمع۔ زنا۔ اوہام۔ خرافات۔ قتل و غارت اور لعن دین میں بد دیانتی و سود وغیرہ۔

ان برائیوں کی وجہ سے وہ اخلاق سے بے بہرہ ہوگئے اور دولت کے نشہ میں یہاں تک کہنے لگے کہ یَدُ اللہِ مَغْلُوْلَۃٌ (۵/۶۴) یعنی خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔

بر فتاند تا روش رزم دریں بزم کہن | دردمندانِ جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند | بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

پیامِ مشرق ۲۳۳

چنانچہ وہی نتیجہ ہوا جس کے متعلق اقبال نے پہلے ہی پیش گوئی کردی تھی ؎

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتہ پیرک افرنگ
ابلیس کے تعویز سے کچھ روز سنبھل جائے!

ضرب کلیم ۱۵۸

بین الاقوامیت وہی مستحکم اور پائندہ ہو سکتی ہے جس کی بنا نیکی اور جذبۂ ایمان پر رکھی گئی ہو جس میں آدمیت و انسانیت کو بیش بہا جوہر تصور کر کے اس کی قدر کی جائے اور جہاں جغرافیائی حد بندی نسلی امتیاز اور قومی ہوس پرستی کی جگہ توحید سے پیدا شدہ عالمگیر برادری کا زریں اصول کارفرما ہو۔ یہ خصوصیت ملت اسلامیہ میں موجود ہے۔ جہاں دین کی وحدت، زبان ملک اور حکومت کے اختلافات پر غالب آکر امت واحدہ، کو قائم رکھتی ہے۔ جہاں اعمال کی بنا پر:۔

قیمتِ یک اسودش صد احمر است | اور
قطرۂ آبِ وضوئے قنبرے | در بہا برتر ز خونِ قیصرے

رموز ۱۵۶

جہاں تفریقِ افراد و ملل کو ذریعہ اقتدار نہیں بنایا جاتا ہے

تفریقِ ملل ، حکمتِ افرنگ کا مقصود

اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم!

مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام

جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

ضربِ کلیم ۵۴

اقبال ایسی ہی عالمگیر برادری کا داعی ہے۔ لیکن اُس کی یہ تعلیم غیر مسلموں سے نفرت یا عداوت نہیں سکھاتی۔ اسلامی نظامِ سیاست و عدالت میں بے شمار احکام ایسے ہیں۔ جو اخوتِ انسانی کے آئینہ دار ہیں اور جن میں غیر مسلمین کی پوری حفاظت کی گئی ہے۔ رسول اکرم صلعم کا غیر مسلموں سے برتاؤ خاص طور پر اسلام کے اعلٰے وارفع اصولوں کو ظاہر کرتا ہے مثال کے طور پہ آپ کا قریش مکہ سے معاہدہ حدیبیہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس میں آپ نے اس حد تک رواداری کا ثبوت دیا کہ قریش کے مطالبہ پر صلح نامہ میں" مِن مُحَمَّدٌ رسول اللہ کی بجائے" محمد بن عبداللہ" لکھنے پر رضامند ہو گئے [1]

بعض غیر مسلم حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ یہ واقعہ اسلام کے ابتدائی دور کا ہے جس میں مصلحتِ وقت کے تقاضا کو مدِنظر رکھا گیا۔ لیکن وہ قرآن کریم کے اس صریح حکم سے ناواقف ہیں۔ جو غیر مسلموں سے برتاؤ کے بارہ میں

---

[1] اس صلح سے تبلیغ کا کام جو مزاحمات کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ از سرِ نو جاری ہو گیا اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔

ہر وقت رسول اکرمؐ کے سامنے تھا کہ۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ ۵/۲	اُس قوم کی نفرت جس نے تم کو کعبہ سے روکا تھا۔ تم کو ادھر کھینچ کر نہ لے جائے کہ تم بھی اُن پر زیادتی کرنے لگو۔

دنیا یہ بھی جانتی ہے کہ کفارِ عرب نے نبی کریمؐ کو انتہائی ایذا دی تھی۔ لیکن فتح مکہ کے بعد جب حضور کو انتقام کی قوت حاصل تھی آپ نے لا تثریب علیکم (تمہارے لیے کوئی تعزیر نہیں) فرما کر سب کو معاف فرما دیا ؎

آں کہ بر اعدا درِ رحمت کشاد مکہ را پیغام لا تثریب داد

اسرار ۲۱

تاریخ اسلام کے اوراق گواہ ہیں کہ اسلام کے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی جتنے عہدنامے غیر مسلموں سے کیے گئے۔ اُن میں نہ صرف اُن کے جان و مال کو محفوظ کیا گیا بلکہ اُن کے عقائد اور اقامت شعائر کی آزادی بھی تسلیم کی گئی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اہل ایلیا سے جو عہدنامہ کیا گیا۔ اُس میں مرقوم تھا کہ:۔

"اہل ایلیا کو جان و مال کی آزادی ہوگی۔ اس کے ساتھ اُن کے کنائس کی آزادی بھی تسلیم کی جاتی ہے اور ان کی ساری قوم کی آزادی کا وعدہ کیا جاتا ہے"

"ان کے کنائس کو نہ توڑا جائے گا۔ نہ نقصان پہنچایا جائے گا نہ انھیں دین تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائے گا"

اسی طرح حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہ کے نام جو مکتوب ارسال کیا وہ اسلامی حسنِ معاشرت اور انصاف کا آئینہ دار ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:۔
"میں مسلمانوں کو اس سے منع کرتا ہوں کہ وہ ذمیوں پر ظلم کریں یا انھیں تکلیف پہنچائیں اور ناحق ان کا مال کھائیں تم نے جو شرائط اُن سے طے کی ہیں۔ انھیں پورا کرو اور اپنے عہد کو اچھی طرح نباہو"

جنگ یرموک کے وقت مسلمانوں نے حمص کا شہر خالی کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی عیسائیوں سے وصول کیا ہوا جزیہ بھی اس بنا پر واپس کر دیا کہ اب وہ اُن لوگوں کی حفاظت کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ اصول تھے۔ جن کی بدولت اہل حمص رو رو کر مسلمانوں کی واپسی کی دعائیں مانگتے تھے

اسلام نے مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کوئی معاشرتی دیوار حائل نہیں کی۔ اگر کوئی یہودی، عیسائی یا زرتشتی (یعنی پارسی) کسی مسلمان کا کھانا چھُولے تو وہ نجس نہیں ہو جاتا۔ شریعتِ اسلامی کی رُو سے اُن میں باہم مناکحت جائز ہے۔

حقیقت میں یہ اولین قدم تھا۔ جو اسلام نے عملاً اتحادِ نوعِ انسان کی خاطر اُٹھایا۔ اس سے اُن لوگوں کو جن کا سیاسی نصب العین تقریباً ایک سا تھا۔ باہم مل جانے کی دعوت دی قرآن پاک کا ارشاد ہے:۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۳/۶۴	اے اہل کتاب ایک بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان برابر ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ مسلمان اور عیسائی اقوام کے باہمی جنگ و جدل اور مغرب کی چیرہ دستیوں نے اس امر کا موقعہ نہیں دیا کہ دنیا کے اسلام اس آیت کے لا انتہا معنوں کو عمل میں لاتی" ؎

انسانی وحدت کو عیاں کرنے کے لیے خطبات میں علامہ اقبال نے قرآن کریم کی اس آیت کا حوالہ دیا ہے:۔

هُوَ الَّذِی خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۞	وہی قادرِ مطلق ہے جس نے تم سب کو نفس واحد سے پیدا کیا۔

وہ لکھتے ہیں کہ زندگی کو ترکیبی وحدت کے طور پر سمجھنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ اس جذبہ کی ترقی کا انحصار بہت حد تک کسی قوم کے دنیاوی واقعات کے دھارے میں داخل ہونے پر ہے۔ اسلام کو یہ موقع اس کی وسیع سلطنت کے قائم ہو جانے کی وجہ سے جلد ہی میسر آگیا۔ اس میں شک نہیں اسلام سے بہت پہلے عیسائیت نے بنی نوع انسان کو مساوات کا پیغام دیا۔ لیکن عیسائی قوم کو جسم واحد کی طرح انسانیت کے تصور کا مکمل احساس بالکل نہ ہوا۔ جیسا کہ فلنٹ نے بجا طور پر کہا ہے "رومی سلطنت میں کوئی عیسائی اہل قلم نہ تھا۔ جس کے دماغ میں انسانی وحدت کا تصور عام سطح سے بلند ہو، روم کے زوال کے بعد اس خیال نے یورپ میں کوئی گہرائی یا پختگی حاصل نہ کی۔ بلکہ اس کے برعکس ملکی اور قومی تعصب نے یورپ کے آرٹ اور ادب میں انسانیت کے وسیع دائرہ کو بہت حد تک محدود کر دینے کا راستہ اختیار کیا۔ اسلام میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ یہاں یہ خیال نہ

؎ از خطبہ آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ الہ آباد

تو فلسفیانہ نظریہ تھا اور نہ ہی شاعرانہ خواب۔ بلکہ اسلام کا مدعا یہ تھا کہ اس خیال کو سماجی تحریک کے طور پہ مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی میں ایک زندہ حقیقت میں تبدیل کر دے اور غیر محسوس طور پہ اس کے بار آور ہونے میں ممد ہو۔[1]

اسلام کی یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ "کائنات انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُن کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے"۔ اسلام مغرب کے اُس گروہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتا جس کا ترجمان کپلنگ ہے اور جو یہ کہتے ہیں کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں آپس میں کبھی نہیں مل سکتے۔ اسلامی نظام کا مخصوص پہلو للہ المشرق والمغرب میں نمایاں ہے۔

علامہ اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط میں اس کی وضاحت کی۔ لکھتے ہیں "دراصل خدا کی ارضی بادشاہت صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام انسان اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔[2] بشرطیکہ وہ نسل اور قومیت کے بتوں کی پرستش ترک کر دیں اور ایک دوسرے کی شخصیت کو تسلیم کر لیں

[1] خطبات صفحہ ۱۸۱ [2] قرآن کریم اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کا ذکر یوں کرتا ہے۔

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتٰبِ ۗ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ ۴/۱۲۳	نہ تمھاری آرزو کے موافق اور نہ اہل کتاب کی آرزو کے موافق ہوگا۔ جو کوئی بُرا عمل کرے اُسے بدلہ دیا جائے گا۔

انجمنیں، حکمبرداریاں اور ملوکیت خواہ وہ جمہوریت کی ہی قبا میں پوشیدہ کیوں نہ ہو۔ انسان کو فوز و فلاح سے آشنا نہیں کر سکتی۔ بلکہ انسانی فلاح تمام انسانوں کی مساوات اور حریت میں پنہاں ہے۔ آج ہمیں اس چیز کی ضرورت ہے کہ سائنس کا محل استعمال قطعی طور پہ بدل دیا جائے۔ ملکی خفیہ سیاسی منصوبوں سے احتراز کیا جائے۔ جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ کمزور و زبوں حال یا ایسی اقوام کو جو عیاری اور حیلہ گری کے فن میں چنداں مہارت نہیں رکھتیں۔ صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو جائیں۔"[۱]

یہ کام عملی طور پر تب مکمل ہو سکتا ہے۔ جب تمام ممالک کی اجتماعی زندگی عملی طور پہ اسلام کی آئینہ دار ہو۔ اور ملکی یا وطنی نظریہ رکھنے کی بجائے سب کا فلسفہ زندگی اور نظام سیاست ان اسلامی اصولوں کے مطابق ہو۔ جن کا مختصر خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے ؟

---

[۱] ڈاکٹر نکلسن کے نام علامہ اقبال کا خط۔ اقبال نامہ صفحہ ۴۶۹ - ۴۷۰

دین و سیاست

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

بال جبریل ۶۲

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سیاسی لحاظ سے ایسی بین الاقوامیت کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس کی بنیاد اخلاقی اصولوں پر نہ ہو۔ ملکی یا وطنی نظریہ کی تنگ گھاٹی میں کوئی جامع نظام سیاست نشوونما نہیں پا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایسے سیاسی نظام پر ایک نگاہ ڈالیں۔ جو مذہب و اخلاق کی پختہ بنیادوں پر کھڑا کیا گیا ہو۔

ظاہری طور پر مذہب و سیاست بالکل الگ الگ علوم ہوتے ہیں۔ مذہب میں خدا اور بندے کے تعلقات سے واسطہ ہوتا ہے اور سیاست میں انسان اور انسان کے معاملات کی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ اس ظاہری نوعیت کے عین مطابق موجودہ زمانہ کا مملکت کا تصور بھی اپنے آپ کو مذہب سے بالکل الگ تھلگ رکھتا ہے۔ حکومت کسی کے مذہب اور اکثر اوقات اخلاق سے بھی اپنے آپ کو بری الذمہ رکھتی ہے۔

سیاست کو مذہب و اخلاق سے علیحدہ رکھنے کی باقاعدہ تلقین۔

"کتاب الملوک" کے اطالوی مصنف و حکیمِ سیاست میکیاولی (متوفی ۱۵۲۷ء) نے کی۔ اُس کی یہ تصنیف سیاست کا قیمتی صحیفہ قرار دیا جاتا ہے۔ اُس کے مطابق مذہب و اخلاق کی کوئی مکمل حیثیت نہیں۔ اُس کے خیال کے مطابق حکومت کو اپنے استحکام کی خاطر ہر طریق اختیار کرنے کی اجازت ہے خواہ طریق اخلاق، مذہب اور دین سے کتنے ہی بعید کیوں نہ ہوں۔ حکومت کا اصول صرف یہ ہے کہ وہ اپنی عظمت کو برقرار رکھے اور اس مقصد کے لیے جیسے بھی عمل کی ضرورت ہو۔ اختیار کرلے۔ اس نظریہ کے مطابق مذہب و اخلاق محض انفرادی اور پرائیویٹ چیزیں ہیں۔ جن کا ملک کے نظم و نسق اور سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔

اگرچہ میکیاولی کے فلسفہ کو زبانی طور پر ناپسند کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں تقریباً تمام حکومتیں اسی کے اصولوں پہ کاربند دکھائی دیتی ہیں۔ اصل میں میکیاولی نے دنیا کے سامنے کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا بلکہ حکومتیں اُس کی تصنیف سے قبل ہی اُس کے طرزِ سیاست پر عمل کرتی چلی آئی ہیں البتہ ایک فرق ضرور ہوا کہ اُس کے فلسفہ نے اُن حکومتوں کے عمل و فعل کو ایک ضابطہ کا جواز دے دیا اُس کا نتیجہ آخر کار ڈکٹیٹروں کے طرزِ حکومت میں ظاہر ہوا اس کی مثال روس میں بالشویک اٹلی میں فسطائیت اور جرمنی میں نازیت کے لباس میں دنیا کے سامنے آئی مغربی جمہوری حکومتیں بھی حکمتِ عملی (ڈپلومیسی) وغیرہ کے ناموں کے ماتحت انہی اصولوں پہ عامل ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ کی

سیاست میں ہر قسم کی حیلہ سازی، جھوٹ اور فریب کو جائز سمجھ لیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور اسے شیطان کی تعلیم بتایا ہے ؎

دہریت چوں جامۂ مذہب درید | مرسلے از حضرتِ شیطان رسید
آں فلارنسادیٔ باطل پرستؔ[1] | سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
نسخۂ بہرِ شہنشاہاں نوشت | در گِلِ ما دانۂ پیکار کشت
فطرتِ او سوئے ظلمت بردہ رخت | حق ز تیغ خامۂ او لخت لخت
بت گری مانندِ آذر پیشہ اش | بست نقش تازہ اندیشہ اش
مملکت را دینِ او معبود ساخت | فکرِ او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد | نقد حق را بر عیارِ سود زد
باطل از تعلیمِ او بالیدہ است | حیلہ اندازی فنے گردیدہ است

طرحِ تدبیرِ زبوں فرجام ریخت
ایں خسک[2] در جادۂ ایام ریخت رموز ۱۳۴

قدیم زمانے میں دین و سیاست میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی تھی کیونکہ بہت سے امور غرضیکہ جنگ وغیرہ بھی مذہبی مراسم کے طور پر ہی سرانجام دیے جاتے تھے۔ یونان کی قدیم سلطنت میں ان میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ رومیوں نے دنیاوی قانون کو مذہب سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے بھی مذہب

[1] میکیاولی [2] خشک کانٹے

سیاست کو جدا کرنے کا اقدام کیا۔ جب انھوں نے اپنے نبی سے کہا:۔

فَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ۲۴۶ ۲

اُنھوں نے اپنے پیغمبر سے درخواست کی۔ کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کیجیے کہ ہم (اس کے سہارے سے) اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔

اسی طرح انجیل کا قول کہ "قیصر کی چیزیں قیصر کو دے دو اور کلیسا کی کلیسا کو" بھی ظاہر کرتا ہے کہ عیسائیت بھی دونوں کے امتزاج کو پسند نہیں کرتی۔ یہ حقیقت ہے کہ عیسائی ملکوں نے ان کو الگ الگ کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ کلیسا کی بنیاد رہبانیت پر تھی جس میں دنیاوی امور کو دخل نہ تھا۔ بادشاہ کلیسا کی سرپرستی اور اقتدار کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہو گئی۔ لوتھر نے باقاعدہ طور پر کلیسا کی حکومت کے خلاف احتجاج کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مسیح علیہ السلام کا عالمگیر نظامِ اخلاق نیست و نابود ہو گیا اور اس کی جگہ اخلاقیات و سیاسیات کے قومی نظامات نے لے لی اور اہلِ مغرب اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہوئے کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے[1] علامہ اقبال نے اس حالت کو اپنے کلام میں یوں بیان کیا ہے ؎

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سر بلندی ہے یہ سر بزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری

[1] اقبال کا مضمون "سیاست اسلام و قومیت"۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

بال جبریل ۱۶۰

دوسری چیز جس نے اس اختلاف کو وسیع کرنے میں مدد دی مادہ اور روح کا فرق ہے۔ جو یورپ میں مخصوص حالات میں پیش کیا جاتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان مادیت میں گم ہو کر رہ گئے اور روحانیت کی طرف ان کے قدم نہ اُٹھ سکے گذشتہ صدی میں یورپ نے یہ نظریہ قائم کیا کہ مادہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے جس میں طبعی قوانین کے ذریعہ خود بخود زندگی پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے انسانی شعور تک جا پہنچی۔ مادہ پرستوں کے خیال میں انسان کی قیمت اور حیثیت ایک مشین سے زیادہ نہیں جو مختلف پرزوں کی ترتیب سے چل رہی ہے لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک مشین کے متعلق یہ تصور کرنا ہی بے معنی ہے کہ وہ خود اپنے قیام و بقا یا مزید نشو و ارتقا کا ذریعہ بن سکے۔ نیز مادہ پرستی سے انسانی شعور کو ثابت کرنا بھی ناممکن ہے۔

مادہ پرستی نے اس طریق پر انسانیت کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ اس نظریہ نے مادہ کو زندگی کا اصل قرار دے کر انسان کے لیے صرف یہ نصب العین مقرر کر دیا کہ وہ ان کے محض مادی پہلو کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس تہذیب نے مادی کامرانیوں میں ڈوب کر مادہ کی بے پناہ قوتوں کو آزاد چھوڑ دیا۔ اور آخر انہی قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہونے لگے اور تہذیب پست عناصر کی طرف گرتی چلی گئی حقیقت میں ے

لبا لب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا	بالِ جبریل ۲۹

علامہ اقبال کے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے دراصل یہ روحانی اور دنیوی زندگی کا غلط امتیاز ہے جس سے مغرب کے سیاسی اور مذہبی افکار بیشتر طور پر متاثر ہوئے ہیں اور جس سے یورپ کی مسیحی ریاستوں نے عملاً مذہب سے کلیتہً علیحدگی اختیار کر لی ہے" اس سے چند متفرق اور بے ربط سلطنتیں قائم ہو گئی ہیں جن پر کسی انسانی جذبے کی بجائے قومی اغراض کی حکمرانی ہے"۔ لے

زندگی کے مسائل کا حل مادہ اور روح دونوں کے امتزاج میں ہے یورپ اس چیز کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ مادہ اور روح کا فرق مٹا کر ان میں امتزاج کس طرح پیدا کیا جائے۔ وہ مادہ کو زندگی کا سرچشمہ خیال کرتا ہے لیکن مادہ کا سرچشمہ بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے بالکل برعکس" اسلام کے نزدیک ذاتِ انسانی ایک وحدت ہے وہ مادے اور روح کی کسی ناقابلِ اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات کلیسا اور ریاست، اور روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزا ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جس کو ایک روحانی دنیا کی خاطر جو کسی دوسری جگہ واقع ہے۔ ترک کر دیا جائے۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید مکانی و زمانی میں ہوتا ہے"۔ لے

اسلام اس نظریہ سے متفق نہیں۔ جس کے مطابق [illegible]

لے علامہ اقبال کا مضمون۔ سیاست اسلام قومیت

کے درمیان ایسے ذاتی تعلق کا نام ہے جس کو دنیاوی معاملات سے مطلق کوئی سروکار نہیں۔ اسلام میں مذہب کے معانی اس سے مختلف ہیں۔ اسلامی عبودیت الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے قوانین چھوڑ کر قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کی جائے۔ اس میں دین و دنیا دونوں کے اصول شامل ہوتے ہیں۔ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کی صورت میں سنت۔ قوتوں کو یہ اختیار نہیں رہتا کہ وہ محکوم انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں یا اُن کے احوال کو اپنے فائدہ کے لیے استعمال کریں۔ اسلام اس قسم کے اصولوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ جو بعض دوسرے نظام سیاست اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً اسلام میں یہ چیز قابلِ قبول نہیں کہ بادشاہ کبھی غلطی نہیں کرتا، (برطانیہ کا قانون)، یا پوپ کبھی غلطی نہیں کرتا (پاپائیت کا قانون)، یا مسولینی کبھی غلطی نہیں کرتا، (فسطائیت کا قانون)۔ اس نظام کے مطابق افراد کا غلطی کرنا ممکنات میں سے ہے اور اسی لیے اِن کی رہنمائی کے لیے ایسا ضابطہ دیا گیا ہے۔ جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔

لیکن اس امر کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کے لیے قلبِ سلیم کی ضرورت ہے۔ قوم مدین نے حضرت شعیبؑ سے کہا۔ کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ کی نمازیں کیسی ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ ہم اپنے اموال کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہیں کر سکتے:۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ	لوگوں نے کہا "اے شعیب کیا تیری یہ نمازیں تجھے
تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا	یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آکر کہے کہ ہم اُن معبودوں کو
يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ	چھوڑ دیں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے رہے۔

تَفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُاط اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ۔ ۱۱/۸۷	ہیں۔ یا یہ کہ ہمیں اختیار نہیں کہ ہم اپنے مال میں جس طرح کا تصرف چاہیں کریں بس تم ہی ایک تحمل والے راست باز آدمی رہ گئے ہو۔

قوم مدین کی حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ وہ دین اور دنیا کو ایک دوسرے سے الگ الگ خیال کرتے تھے اور یہ بات تسلیم نہ کرتے تھے کہ حقیقی اور مستقل نظام حیات میں ان ہر دو کو پوری اہمیت حاصل ہے۔ یہ کائنات زندگی کے لیے محور کا کام دیتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے محافظ ہیں ؎

این دو قوت حافظِ یک دیگر اند

کائنات زندگی را محور اند جاوید نامہ ۱۸۲

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے اور خدا تعالے نے اپنے نیک بندوں سے دونوں کے ثمرات کا وعدہ فرمایا۔ اسلام نہ رہبانیت ہے اور نہ ایسی فرمانروائی جس کو مذہب و اخلاق سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ بلکہ اس میں مذہب و سیاست کا نفیس امتزاج رکھ کر انسانیت کو محفوظ کر دیا گیا ہے ؎

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشین کا بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

بانگ درا ۱۲۰

اللہ تعالے نے تمام امور میں دنیا کے ساتھ دین کا امتزاج قائم رکھا۔ خدا کی راہ میں جان دینے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کا انعام دیا ہے

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۳/۱۴۸	اللہ تعالٰے نے انھیں دنیا کا ثواب اور آخرت کے ثواب کی خوبی عطا کی۔ اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالٰے کی راہ میں ہجرت کرنے والوںؓ کے لیے دنیا و آخرت ہر دو کا بدلہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۱۶/۴۱	جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں وطن چھوڑا بعد اس کے ظلم کیے گئے ہم ان کو دنیا میں اچھی جگہ دیں گے اور آخرت میں بہت بڑا ثواب۔

مسلمان کے لیے قرآن کریم نے بہترین دعا بھی دین و دنیا کی تفریق مٹانے والی بیان کی ہے۔ بلکہ دنیا کی بھلائی کا ذکر پہلے کیا ہے۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۲/۲۰۱	اے پروردگار ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

اُس آدمی کے لیے جو صرف دنیا کا طالب ہو۔ قرآن کریم نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا نقصان آپ کرتا ہے۔

وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا	جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو ہم اُس کو اُس میں سے کچھ دے دیں گے

وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِن نَّصِيْبٍ . ۲۰/۴۲ — مگر اس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

اللہ تعالے کی مرضی تو یہ ہے کہ انسان دونوں کو طلب کرے۔ اور دونوں کے لیے سعی کرے ملک و دولت اگر جسم کا درجہ رکھتے ہیں تو دین بمنزلہ روح رواں ہے۔ دونوں کا ربط ضروری ہے ؎

ایں نکتہ کشائندۂ اسرار نہاں است
ملک است تنِ خاکی و دیں روح رواں است
تنِ زندہ و جاں زندہ ز ربطِ تن و جان است
با خرقہ و سجّادہ و شمشیر و سناں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز — زبورِ عجم ۱۱۰

اسلام اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اخلاق و مذہب کو ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ قرار دینے سے آخر کار سوسائٹی کا نظام فاسد ہو جاتا ہے۔ اشخاص کے اثرات لازمی طور پر سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی بے ضرر ندیاں آخر کار طوفان خیز دریا بن جاتے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اُسے حق کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتا ہے اس کے لیے حکومت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قوت نہ ہو تو اخلاقی نظام کی تکمیل نہیں ہو سکتی ؎

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

ضرب کلیم ۵۴

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کی ذات میں رسالت اور تخت کو اسی وجہ سے اکٹھا کر دیا کہ دین کے ساتھ دنیا کے معاملات کا الحاق قابل اعتراض نہ سمجھا جائے یا صرف دنیا کو ہی مقصود نہ بنا لیا جائے۔ رسول اکرم صلعم کا زمانہ بھی مکمل طور پر دین و دنیا کے بہترین امتزاج کا تھا۔ آپ کے پاس نبوت بھی تھی اور سلطنت بھی۔

بعض مغربی مصنف اس ضروری امتزاج کو نہ سمجھتے ہوئے حضور کی مکی و مدنی زندگی کے فرق کو نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ آپؐ مکہ میں مسکینی کی زندگی بسر کرتے رہے اور آپ کا کام صرف مذہب کی تبلیغ رہا۔ لیکن مدینہ میں آکر جب حالات سازگار ہو گئے تو حکومت کا قیام بھی عمل میں لے آئے۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار پروفیسر جوزف ہل نے اپنے ایک مقالے موسومہ 'عربی ثقافت' میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جس شخص نے مکہ سے ہجرت اختیار کی اور بعد میں مدینہ میں آکر زندگی بسر کی۔ وہ ایک نہیں بلکہ دو جدا شخص معلوم ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مذہب کے مبلغ تھے اور اس کے لیے خوشی سے تمام مصائب برداشت کرتے رہے اس وقت خدا کا پیامبر تسلیم کئے جانے کے علاوہ اور کسی قسم کا امتیاز نہیں چاہتے تھے۔ قوت حاصل کرنے کا خیال تک بھی ان کے دل

میں نہ تھا اور یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی نظامِ حکومت قائم کر کے خود اس کا سردار بننے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن جب وہ مدینہ میں داخل ہوئے تو نبی پس منظر میں چلا گیا اور سیاست دان آگے آ گیا۔ اب نبوت حکمرانی کی زینت بن گئی.... جسے انھوں نے قوت و اقتدار کے حربہ کے طور پر استعمال کیا

یہ خیالات اس لاعلمی کا نتیجہ ہیں۔ جو مغرب کو اسلام کی اصل روح کے متعلق ہے وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ حضور کی مکی و مدنی زندگی کا محور ایک ہی تھا۔ مدینہ منورہ کی زندگی اس فکر کا لازمی نتیجہ تھا۔ جو مکہ میں پیدا ہوا اور جس نے دین و دنیا اور مذہب و سیاست کو۔ الگ الگ قرار نہیں دیا بلکہ ایک کو قیام تو دوسرے کو بمنزلہ سجود سمجھ کر ہر دو کی تکمیل پر زور دیا ۔

خسروی شمشیر و درویشی نگہ ہر دو گوہر از محیط لا الٰہ

فقر و شاہی واردات مصطفےٰ است این تجلیہائے ذات مصطفےٰ است

این دو قوت از وجود مومن است

این قیام وآں سجود مومن است مسافر ۳

یہ کیفیت خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی رہی۔ حضرت معاویہ کا زمانہ خلافت و ملوکیت کے درمیان پہلی کڑی ثابت ہوا۔ سب سے پہلے انھوں نے ہی دہلیز پر دربان و حاجب مقرر کرنے کی رسم شروع کی۔ ان کے بعد ملوکیت و سلطنت کا پہلو نمایاں ہونے لگا۔ بنی اُمیہ و بنی عباس کے زمانہ میں صرف ملوکیت و سلطنت رہ گئی اور آہستہ آہستہ وہ تمام لوازمات ساتھ آ گئے جو محض دنیاوی طریق حکومت میں ہوتے ہیں۔ بنی عباس کے آخری دور میں سلطنت

کی بنا دکروفریب پر قائم ہوئی۔ دین داخلاق کا عنصر غائب ہوا تو قرآن کریم کا فیصلہ سچا ہوا اور وہ سلطنت قائم نہ رہ سکی حتےٰ کہ غیر مسلموں نے بھی اس بات کو محسوس کیا اور اس پر شہادت دی۔ چوتھی صدی ہجری میں قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ نے خلیفہ عباسی کو ایک خط میں لکھا کہ "اے اہلِ بغداد اب تمہارے لیے تباہی ہے۔ تمہارا ملک کمزور ہو گیا ہے۔ اب تم ذلت کے ساتھ سرزمین حجاز کو واپس چلے جاؤ اور بلادِ روم خالی کر دو۔ ہم یہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں کہ ہم تمہارے اُوپر اس وقت غالب آسکے ہیں جب تمہاری حکومت میں ضعیف کی حفاظت کا انتظام نہیں رہا جب ظلم وستم کا دور دورہ ہو گیا ہے۔ تمہارے اعمال بدہو گئے اور تمہارے حاکم اپنے عدالتی فیصلوں کو اس طرح فروخت کرنے لگ گئے۔ جس طرح یوسف علیہ السلام چند کھوٹے درہموں کے عوض بیچ دئے گئے"۔

موجودہ زمانہ کی مغربی حکومتوں میں بھی اخلاقی عنصر کی کمی ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں "اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت۔ قومیت۔ اشتراکیت۔ فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سپرد کی گئی ہے۔ وہ خونریزی، سفاکی

اور زبردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں۔ انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں۔ اُنھوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس لیے کہ اُن کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ اُنھوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد اُن کے اخلاق، اُن کے مذہب، اُن کی معاشرتی روایات، اُن کے ادب اور اُن کے اموال پر دستِ تطاول دراز کیا۔ پھر اُن میں تفرقہ ڈال کر اِن بدبختوں کو خونریزی اور برادرکشی میں مصروف کر دیا تاکہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش و غافل رہیں اور استعمار کی جونک چپ چاپ اُن کا لہو پیتی رہے۔[1]

قرآن کریم نے ایسی حالت کا نقشہ کتنے درست طریق پر کھینچا ہے:۔

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۔ ۲۷/۳۴	بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ جب وہ کسی شہر میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو اُس کو خراب کرتے ہیں اور وہاں کے اہلِ عزت کو ذلیل و خوار کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے اس حقیقت کو نظم کیا ہے ؎

---

[1] ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو پر سالِ نو کا پیغام۔ حرفِ اقبال صفحہ ۲۲۵

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ المُلُوْکَ
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں ساز دلبری

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری بانگ درا ۲۹۶

فرعون نے جو ملوکیت کے ظلم وستم کا مجسمہ تھا۔ بنی اسرائیل کی محکوم قوم کی تباہی کا یہ طریق اختیار کیا کہ اُس قوم کے تمام بیٹوں کو مار دیا جائے اور صرف لڑکیاں زندہ رہنے دی جائیں۔ حاکم قومیں اسی طرح اپنی محکوم قوموں کو تباہ کرنے کے منصوبے سوچ لیا کرتی ہیں ؎

حاکمی از ضعفِ محکوماں قوی است
بخش از حرمانِ محروماں قوی است

جاوید نامہ ۱۰۸

ملوکیت واستعمار کو ہوا دینے والے یہ خوب سمجھتے ہیں کہ غلامی ایسی افیون ہے جو آہستہ آہستہ افراد کی ذاتی خوبیوں اور جماعت کے اجتماعی رنگ کو مدھم کر دیتی ہے۔ وقت آتا ہے۔ جب خود غلام اُسی کہنہ و فرسودہ نظام کو پسند کرنے لگ جاتے

ہیں۔ مثال کے لیے قرآن کریم میں قوم موسیٰ کا ذکر ہے جو فرعون کی غلامی میں خوش تھے۔ حالانکہ انھیں غلامی کی انتہائی ذلت میں رکھا گیا۔ اُن سے مویشیوں کی طرح کام لیا گیا اور اہرام مصر جیسی عمارتیں بنوائی گئیں جن پر لاکھوں من پتھر خرچ ہوا۔

محکوم کے لیے قفس حلال اور آشیانہ حرام ہو جاتا ہے۔

از غلامی دل بمیرد در بدن | از غلامی روح گردد بار تن
از غلامی ضعف پیری در شباب | از غلامی شیر غاب افگندہ ناب
از غلامی بزم ملت فرد فرد | ایں و آں با ایں و آں اندر نبرد
آں یکے اندر سجود ایں در قیام | کاروبارش چوں صلوٰۃ بے امام
از غلامی مرد حق زنار بند | از غلامی گوہرش ناارجمند
کور ذوق و نیش را دانستہ نوش | مردۂ بے مرگ و نعش خود بدوش

زبور عجم ۲۴۹

غلاموں کے دل سے ذوقِ ایجاد دمٹ جاتا رہتا ہے سو وہ کہنہ و فرسودہ نظام کی اندھا دھند تقلید کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ اور خاکِ گور سے مجاوروں کی مانند رزق حاصل کرنے کو ہی اپنی زندگی کا مقصود ٹھہرا لیتے ہیں ؎

در غلامی تن ز جاں گردد تہی | از تنِ بے جاں چہ امید بہی
کیش او تقلید و کارش آذری ست | ندرت اندر مذہب او کافری ست
تازگیہا وہم و شک افزایدش | کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش

چشمِ او بر رفتہ از آئندہ کور ۔ چوں مجاور رزقِ او از خاکِ گور

زبورِ عجم ۲۵۷

ایسی قوم کے افرادِ جسم کو قائم رکھنے کے لیے دین و دانش کو قربان کر دیتے ہیں ؎

دین و دانش را غلام ارزاں دہد ۔ تا بدن را زندہ دارد جاں دہد
گرچہ بر لب ہائے او نامِ خداست ۔ قبلۂ او طاقتِ فرماں رواست

زبورِ عجم ۲۵۸

لادین قوت جو اپنے مفاد کے لیے دوسروں کو دائمی غلامی میں رکھنے کے لیے ہر زمانہ میں مختلف طریق اختیار کرتی رہی ہے ۔ ایک زبردست سیل ہے ۔ جس میں عقل و نظر اور علم و ہنر سب خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں ۔ اس نشۂ قوت نے انسانیت کی قبا کو کئی بار چاک کیا ہے ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے
صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

ضربِ کلیم ۲۳

ارسطو نے اسی وجہ سے "مسلح بلے الضانی" کو سب سے زیادہ خوف ناک چیز قرار دیا۔ ایسی لادین قوت کی بنیاد مادی تہذیب پر ہوتی ہے۔ جو سرمایہ کی غلام ہوتی ہے۔ سیاسی اقتدار کو دولت سے ملحق سمجھا جاتا ہے۔ سیاست دانوں کو سرمایہ داروں کی مرضی کے مطابق جنگ یا صلح اور قوانین کا اجراء یا تنسیخ کرنی پڑتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت صرف سرمایہ داروں کے پاس جمع ہوتی جاتی ہے اور وہ عوام کی کمائی پر خود طاقت ور بنتے جاتے ہیں ان کی شراب کے ارغوانی جام حقیقت میں مزدوروں اور کسانوں کے خون سے ہی رنگین ہوتے ہیں ؎

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب

زبور عجم ۱۳۷

نہ صرف یہ بلکہ سرمایہ دار کے ہاتھوں مزدور کی عزت و آبرو بھی محفوظ نہیں رہتی ؎

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد آبروئے دخترِ مزدور برد

پس چہ باید کرد ۲۷

اس کے باوجود سرمایہ دار اصل کمانے والے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں ؎

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

بانگ درا ۲۹۶

اسی طرح غریبوں اور مزدوروں کی محنت سے سرمایہ دار ناکردہ کار کا ریشمیں لباس تیار ہوتا ہے۔ مزدور اور غریب لوگ جن کا بازو موجب تقویتِ شاہ ہے اور جن کے گریہ سحر سے خرابہ بھی رشکِ گلستاں ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کو پروانہ کی مانند طوافِ دیگراں میں ختم کر دیتے ہیں ؎

زِ مزدِ بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر
زِ خوئے فشانیِ من لعلِ خاتمِ والی
زِ اشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر
زِ خونِ من چو زلو فربہی کلیسا را
بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر
خرابہ رشکِ گلستاں زِ گریۂ سحرم
شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم
بطوفِ شمع چوں پروانہ زیستن تا کے
زِ خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے پیامِ مشرق ۲۵۰

یہ طریق اسلام کے احکام لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کی صریح خلاف ورزی ہے ؎

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار
عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناسازگار

حکم حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

بانگِ درا ۳۲۵

مادی تہذیب پر انحصار رکھنے والی تمام قوموں کا یہی حال ہے۔ مغربی اقوام میں بڑی بڑی طاقتیں سرمایہ داری کی بدولت چھوٹی طاقتوں کو ہمیشہ مرعوب رکھ کر ان کی محنت سے خود فائدہ اٹھاتی رہتی ہیں۔ اس طریق کار کو نوآبادیات۔ استبداد۔ حلقہ اثر اور پرامن مداخلت وغیرہ کے سیاسی نام دے کر جائز ثابت کیا جاتا ہے یعنی قفس میں پھول رکھ کر اسیر کو اسیری پر رضامند کیا جاتا ہے ؎

یہ مہر ہے بے مہری صیاد کا پردہ — آئی نہ مرے کام مری تازہ صفیری!
رکھنے لگا مرجھائے ہوئے پھول قفس میں — شاید کہ اسیروں کو گوارا ہو اسیری

ضرب کلیم ۱۴۴

پختہ کار حکومتیں آئین و قانون کے ذریعہ محکوم کو اسی زندگی پر مطمئن کر لیتی ہیں ؎

قاہرِ امر کہ باشد پختہ کار — از قوانین گردِ خود بندد حصار
جرّہ شاہین تیز چنگ و زود گیر — صعوہ را در کارہا گیرد مشیر
قاہری را شرع و دستورے دہد — بے بصیرت سرمہ با کورے دہد
حاصلِ آئین و دستورِ ملوک؟
دہ خدایان فربہ و دہقاں چو دوک — جاوید نامہ ۶۹

اگر محکوم قومیں بیدار ہونے لگیں تو انہیں اصلاحات و حقوق کے خواب آور طریقوں سے پھر تھپک کر سلا دیا جاتا ہے ؎

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

بانگِ درا ۲۹۶

اور یورپ اِس طریق کا پرانا شاطر ہے ؎

اقبال کو شک اِس کی شرافت میں نہیں ہے
ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار

ضربِ کلیم ۱۵۵

مسولینی کا اپنے حریفوں کو جواب مغربی سیاست و تہذیب کا پردہ چاک کرنے کے لیے کافی ہے ؎

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جُرم؟
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو بُرا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج؟
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج

آں سبزِ چوبِ نَے کی آبیاری میں رہے
اور تم دُنیا کے بحر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لُوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لُوٹی کشتِ دہقاں، تم نے لُوٹے تخت و تاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کُشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج!

ضربِ کلیم ۱۵۱

تہذیبِ مغربی کا کمال مختصر طور پر یہ ہے کہ ؎
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

ضربِ کلیم ۱۴۷

اور تمام بحث کا نتیجہ یہ کہ ؎
آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شدہ است

پیامِ مشرق ۲۳۶

سرمایہ داری کی اس لعنت کا ردِ عمل ہمارے وقتوں میں سوشلزم کی صورت میں نمودار ہوا۔ اور روسی بالشوزم کی شکل میں دنیا کے سامنے موجود ہے۔ دراصل اشتراکیت موجودہ زمانہ کے فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ ایرانِ قدیم میں بھی ہمیں نوشیروانِ عادل کے زمانہ ۵۳۱ء تا ۵۷۹ء میں اشتراکیت کے پہلے پیغمبر مزدک کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اُس کی تعلیم کے مخصوص خدوخال یہ تھے کہ تمام [illegible]

مساوی ہیں اور انفرادی جائداد کا تصوّر مخالف دیوتاؤں کا پیش کردہ ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی کائنات کو لامحدود تباہی کا منظر بنا دیں۔[1] اس نے دولت اور عورت میں ہر انسان کو ایک دوسرے کا شریک بنایا۔ عیش پرست امرا و ہوس ران عوام دونوں نے ان عقائد کی ترویج میں نمایاں حصّہ لیا۔ نتیجہ فحش و عصیان اور ظلم و ستم ہوا۔ عصمت و پاک دامنی کی جگہ حیوانی جذبات نے لے لی۔ سرمایہ داری کی خرابی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس کی جگہ اور کئی بیماریاں قوم کے جسم میں پیدا ہو گئیں۔

موجودہ زمانہ میں بھی اشتراکیت نے سرمایہ داری کو دُور کیا۔ لیکن ملکیت کو جُرم قرار دے کر افراد کی ترقی کے راستہ کو ہمیشہ کے لیے مسدود کر دیا۔ تمدّن کی اساس مساوات شکم پہ رکھ دی معاش کو بنیادی مسئلہ قرار دیا اور تمدن کے ہر پہلو کا حل معاشی نقطۂ نظر سے کیا۔ حالانکہ معاش انسان کے لیے مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ اعلےٰ و ارفع مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ سوشلزم کے پیغمبر کارل مارکس (۱۸۸۳ - ۱۸۱۹) کی تعلیم کا بنیادی نقص یہی ہے ؎

دین آں پیغمبرِ حق ناشناس بر مساواتِ شکم دارد اساس

جاوید نامہ ۶۹

مارکس یہودی باپ کا بیٹا تھا۔ اس نے اشتراکیت کا فلسفہ اپنی کتاب "سرمایہ" کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کی پہلی

[1] ... جلد صفحہ ۴۲

اشاعت ۱۸۶۷ء میں ہوئی۔ اُسی کی وجہ سے مارکس کو سوشلزم کا پیغمبر کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اُس کے نظریہ کی تشریح کی ہے

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل ۔۔۔ یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است ۔۔۔ قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را ۔۔۔ در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بُو از تن نگیرد جانِ پاک ۔۔۔ جز بہ تن کارے ندارد اشتراک

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گِل است — جاوید نامہ ۶۹

سوشلزم کی مساوات غلط قسم کی ہے۔ اس میں اخلاق کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے" سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں اور اِس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا"[۱] اُس نے مادہ کو اصل الاصول قرار دیا اور دُنیا کو مادہ کی ہی کشمکش قرار دیا۔ سوسائٹی میں معاشی تصادم اور اخلاق و مذہب غرضیکہ ہر چیز کو مادہ کے تصادم کا نتیجہ بنایا اور اِس فلسفہ کو اُس نے متصادم مادیت کا نام دیا۔

صحیح مساوات یہ نہیں ہے کہ عالم و جاہل اور نیک و بد کو برابر کر دیں

[۱] خواجہ غلام السیدین کے نام علامہ اقبال کا خط۔ اقبال نامہ صفحہ ۲۱۹

[۲] هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۔۔۔ کیا وہ جو جانتے ہیں اور وہ [illegible] [illegible]

جائے ۔ اس قسم کی مساوات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اچھے اور بُرے کا امتیاز مٹ جاتا ہے اور قوم کا اخلاق گر کر آخرکار اُسے تباہی کی طرف لے جاتا ہے ۔ اشتراکیت نے مذہب و اخلاق کی پابندی ہٹا کر مزدوروں میں وہی حیلہ سازی پیدا کر دی جس کا حل کرنا مطلوب تھا ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا!
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

بال جبریل ۶۲

خود برہمن طواف کا دلدادہ ہو تو بُتوں کے عشوہ و ناز کا کیا قصور۔ اور جب رہبر متاعِ خویش کا خود رہزن ہو تو کسی کا کیا گلہ یہی حال اشتراکیت کا ہے جو پرانے بتوں کو توڑ کر ان کی جگہ نئے بت بنا رہی ہے ۔ اور ان کا طواف اپنی سرشت کے مطابق کر رہی ہے ۔ جمہور کو حکومت دی گئی ۔ لیکن اُن پر اخلاق کی کوئی پابندی عائد نہ کی گئی حرص و ہوس اُسی طرح زندہ رہی ۔ فرق صرف یہ ہوا کہ بُت تبدیل ہو گئے لیکن سرشت برہمن میں کوئی فرق نہ آیا ؎

گناہِ عشوہ و نازِ بتاں چیست | طواف اندر سرشتِ برہمن ہست
دما دم نو خدا وندان تراشد | کہ بیزار از خدایانِ کہن ہست
ز جورِ رہزناں کم گو کہ راہرو | متاعِ خویش را خود راہزن ہست
اگر تاج کئی جمہور پوشد | ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست
ہوس اندر دلِ آدم نہ میرد | ہماں آتش میانِ مرزغن ہست

نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست
پیام مشرق ۲۵۰

روس نے عالم پیر کی شکست کا اعلان تو خوب کیا۔ لیکن جہان نو کی تعمیر درست طریق پر نہیں کی۔ اُس کا انقلاب لا الٰہ کی تعبیر ہے یہی کام آج سے چودہ سو برس پہلے مسلمان بھی کر چکے ہیں۔ سید جمال الدین افغانی امت روسیہ کو پیغام دیتے ہوئے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

تو کہ طرح دیگرے انداختی
دل ز دستور کہن پرداختی!
ہمچو ما اسلامیان اندر جہان
قیصریت را شکستی استخوان

لیکن امت روسیہ لَا کے چکر سے نکل کر اِلَّا کے دائرہ میں نہ آ سکی۔ وہ لَا کا مقام طے کر کے ہار گئی۔ اُس نے لَا سلاطین، لَا کلیسا اور لَا اِلٰہ کی تعلیم دی۔ لیکن اس کے بعد آنے والے اِلَّا کے مقامات کو درست طریق پر طے نہ کیا اور یہی اس نظام کی بڑی کمزوری ہے ؎

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں
از ضمیرش حرف لَا آمد بروں
آں نظام کہنہ را برہم زد است
تیز نیشے بر رگ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ
فکر او در تند باد لَا بماند
مرکب خود را سوئے اِلَّا نراند

پس چہ باید کرد ۲۲

اقبال نے اسی لیے مارکس کو کلیم بے تجلی، و مسیح بے صلیب

ہے

وہ کلیم بے تجلی! وہ مسیح بے صلیب!

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز

مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب

اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا طبیعت کا فساد

توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

ارمغان حجاز ۲۱۸

لَا سے اِلَّا کی طرف بڑھنے میں روس کے لیے قرآن کی روشنی اور اسلام کا نظام حیات موجود ہے۔ اسلام تمام انسانوں کو باعتبار انسانیت مساوی حقوق عطا کرتا ہے۔ عدل و انصاف میں امیر غریب برابر ہیں اور اپنے ویرائے کی کوئی تمیز نہیں بلکہ یہاں تک فرمایا کہ:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا۟ ۚ ٱعْدِلُوا۟ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ ۸	کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم اُن سے انصاف نہ کرو۔ ہمیشہ انصاف سے کام لو کہ یہ تقوے سے قریب ہے۔

اسلامی سلطنت میں غیر مسلم کی حفاظت حکومت کے ذمہ ہوتی ہے مال اور جائداد کے معاملہ میں بھی غیر مسلموں کے حقوق

محفوظ ہیں۔
اسلام اُس عمل سے بیگانہ ہے۔ جس کی رو سے اپنے قبیلہ میں چوری کو جرم لیکن دوسرے قبیلہ میں اسی فعل کو قابل تعریف سمجھا جاتا تھا۔ اسلام ویدک عہد کی ذات پات کی تعلیم سے بھی ناواقف ہے۔ اس کے نظام میں ایسے قوانین کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ جن کی رو سے برہمن کو خواہ وہ کیسے ہی سنگین جرم کا ارتکاب کرے۔ سزائے موت نہیں ہو سکتی۔ یا اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت سے زنا کرنا جرم نہ سمجھا جائے۔
اسلام روما کے اس قانون کو کوئی اہمیت نہیں دیتا کہ اپنی سلطنت کے اندر تو سب کو انسان سمجھا جائے اور ان حدود کے باہر کے سب لوگوں کو وحشی اور حقوق شہریت سے محروم تصور کیا جائے۔ اسلام ارسطو کی طرح غلام کو ایسا ذی روح جزو تصور نہیں کرتا۔ جس کے ذریعہ نظام حیات چل رہا ہو۔ اسلام تو مزدور کو اُس کے کام کی اُجرت اُس کی جلد کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرتا ہے اور اُجرت کے مقابلہ میں زیادہ کام کو ناپسند کرتا ہے۔ بلکہ ایسا احسان بھی نہیں چاہتا۔ جس کا بدلہ زیادہ لینے کی خواہش ہو۔

وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ ۝ پ۲۹ | زیادہ لینے کی خاطر احسان مت کرو۔

اسلام میں شودروں کی قسم کا کوئی طبقہ نہیں ۔ جسے تعلیم و تربیت اور تہذیب و اخلاق سے اس طرح محروم رکھا جائے کہ وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جائے ۔ کسی عہدہ یا درجہ کے لیے کسی آدمی کو صرف اس وجہ سے محروم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عوام میں سے ہے ۔ بشرطیکہ اس میں ضروری قابلیت موجود ہو ۔ خدا کی درگاہ میں عبادت کے وقت بھی بادشاہ اور رعایا یا امیر و غریب کی کوئی تمیز نہیں ۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اسلام اس مساوات سے واقف نہیں ۔ جو انسانیت کے حقوق کے علاوہ ہر بات اور ہر معاملہ میں انسانوں میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتی اور جس سے سچا اور جھوٹا ، عالم اور جاہل ، صالح اور فاسق سب ایک ہی سطح پر شمار کر لیے جاتے ہیں ۔ معاشی لحاظ سے بھی اسلام ایک کی دوسرے پر رزق میں برتری کو تسلیم کرتا ہے اور جذبۂ ملکیت کو بھی جائز ٹھہراتا ہے ۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے :-

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ	ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کی معیشت تقسیم کر دی ہے اور بعض کے درجے بعض پر بلند کر دیئے ہیں ۔ تاکہ اس

لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ ۳۲/۴۳	طرح ایک دوسرے کو اپنا محکوم (خدمتگار) ٹھہرائیں ۔

دوسری جگہ فرمایا :۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ ج ۱۶/۷۱	اللہ نے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام دولت و ملکیت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے ۔ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ "اسلام نے دولت کو معشیت انسانی کا ستون قرار دیا ہے اور قرآن مجید نے مال کو بلند پایہ عطا کیا ہے ۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم میں مال کو پچیس جگہ "فضل" کہا ہے ۔ اکیس مقام پر لفظ 'خیر' کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے ۔ بارہ مرتبہ "حسنہ" اور "رحمۃ" کے لفظ سے یاد کیا ہے (اس کے علاوہ) اسلام کے فرائض خمسہ میں دو فرض کے ادا کرنے کا شرف صرف اہل ثروت کو ہوا ہے" [1]

یہاں اسلام عیسائیت سے مختلف ہے ۔ جس کے مطابق اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزر جانا آسان ہے مگر اہل ثروت کا آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے ۔ اشتراکیت سے الگ ہے جو افراد کے حقوق ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی ۔ بدھ مت سے بے تعلق ہے ۔ جو اپنے پیروؤں کو بھکشو بن کر بھیک

[1] اسلام کے معاشی تصورات صفحہ ۹۵

کی تلقین کرتا ہے۔ ویدوں کی تعلیم کا مخالف ہے جو انسان کو عمر کے آخری ربع میں بن باسی ہونا ضروری قرار دیتا ہے۔ اسلام میں افراد کو دولت و ملکیت کے پورے مواقع میسّر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اور آئمہ دین میں بھی دولت اور سرمایہ کی کمی نہ تھی۔ امام لیث مصری کی سالانہ آمدنی آٹھ لاکھ روپے تھی۔ حافظ ابن العربی کے پاس دولت کی اس قدر فراوانی تھی کہ اندلس میں شہر اشبیلہ کی فصیل اُنھوں نے اپنے خرچ پر تعمیر کرائی۔ امام ابوالہثیم نے کئی دفعہ اپنے ہم وزن چاندی غربا میں تقسیم کرائی۔

اسلام کے اِن اصولوں کا جواز اس بات میں ہے کہ اگر انسان کو اپنی محنت کا صلہ نہ ملے اور ملکیت بالکل نہ ہو تو ترقی کا جذبہ مفقود ہو کر تمدن کی تعمیر رُک جاتی ہے۔ انسان کی انفرادیت فنا ہو جاتی ہے اور انسانیت کا معیار گر جاتا ہے زندگی میں جس نے ذمہ داری نہ کی وہ تکمیلِ خودی سے محروم رہا۔ اشتراکیت کے متعلق چھ مصنفین نے ایک کتاب[1] میں مختلف وجوہات بیان کی ہیں جن کی بنا پر وہ اس سے الگ ہونے پر مجبور ہوئے ان میں سے ایک وجہ جسے برٹرنڈرسل بیماری کی اصل جڑ قرار دیتا ہے یہ ہے کہ اِس میں افراد کی ہستی کو مٹا دیا جاتا ہے اور اُنہیں اندھا

[1] کتاب کا نام یہ ہے The God That Failed

دھند تقلید پر مجبور کیا جاتا ہے ۔ رسل تاریخ کو اس بات پر شاہد بتاتا ہے کہ جس زمانہ میں بھی ان بنیادوں پر کوئی نظام قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو نتیجہ ناکامی رہا ۔ اس کی قدیم ترین مثال فیثا غورث[۱] کی ہے جس نے اپنا اقتدار قائم کر کے لوگوں کو جیومیٹری کی تعلیم حاصل کرنے اور مٹر کھانے سے پرہیز کی تلقین کی ۔ معلوم نہیں کہ جیومیٹری سے نفرت کی وجہ تھی یا مٹروں کی محبت کے سبب آخر کار لوگ اس کے مخالف ہو گئے اور وہ فرار کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہوا ۔ یورپ میں یہی حال چند صدیاں پہلے چرچ کا ہوا ۔ جو محبت و الفت کے مذہب سے شروع ہو کر آخر کار احکام کی پیروی کے لیے مذہبی عدالتوں کا محتاج ہوا ۔ انحراف کرنے والوں کو موت کی سزا دی گئی یا آگ میں جلایا گیا ۔ اسی طرح کرامویل کی حکومت جمہوریت و آزادی کے پیغام سے شروع ہو کر آخر فوجی ظلم و ستم کے قیام پر ختم ہوئی ۔ انقلاب فرانس نے بھی افراد کی حفاظت کا نعرہ بلند کیا ۔ لیکن نتیجہ نپولین اعظم کی ذات میں ظاہر ہوا جو افراد کے حقوق کا کوئی روشن پہلو اپنی ذات میں نہ رکھتا تھا ۔

یہ تمام واقعات اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ جہاں جہاں بھی نصب العین کے حصول میں ایسی اندھی تقلید کا مطالبہ کیا گیا کہ ظلم، ظلم نہ رہا اور افراد کی اہمیت مٹ گئی ۔ تو نتیجہ ناکامی و

---

[۱] Phythagoras

نامرادی ہوا۔ خواہشِ اقتدار نہایت شیریں ہوتی ہے۔ یہ ایسا نشہ ہے۔ جو استعمال سے اور زیادہ ہوتا ہے۔ صاحب اقتدار لوگ معمولی شبہات پر بھی اشخاص کو مٹانے سے گریز نہیں کرتے اس طرح مقصود کو پس پشت ڈال کر اس کے حصول کے ذرائع کو مقصود بالذات سمجھ لیا جاتا ہے۔

اگر ہم ایک لمحہ کے لیے اپنی توجہ اسلامی نظام اور اس کے ان احکام پر ڈالیں۔ جو افراد کی جان و مال کی حفاظت کے متعلق بیان کیے گئے ہیں۔ تو ہمیں ان کی لازوال حکمت کا پتہ چلتا ہے اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام افراد کا محافظ ہے اور وہ انھیں ملکیت کے تمام حقوق عطا کرتا ہے۔ بیع اور قرض وغیرہ کی اجازت دیتا ہے۔ اسی طرح ہر قسم کے مبادلہ مالی میں متصرف کی رضامندی اور اختیار کو رکن اول کے طور پر تسلیم کرتا ہے اور صاف حکم دیتا ہے کہ:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۚ ۴/۲۹	اے ایمان والو۔ ناحق ایک دوسرے کے مال خورد برد نہ کیا کرو۔ ہاں آپس کی رضامندی سے تجارت ہو تو ناروا نہیں۔

اس حکم میں رضامندی کو پوری اہمیت دی گئی ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے کا مال ناحق کھانے سے ممانعت کی ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ ۲/۱۸۸	اور آپس میں ناحق ایک دوسرے کا مال کو خورد برد نہ کرو اور نہ مال کو حاکموں کے پاس (رسائی پیدا کرنے کا) ذریعہ بناؤ اور لوگوں کے مال سے جو کچھ ہاتھ لگے ناحق ہضم نہ کر جاؤ۔

یہ احکام اور چور کے لیے اسلام کی مقرر کردہ سخت سزا جہاں ایک طرف اسلام میں ملکیت کے اعتراف اور اس کی حریت کو ثابت کرتے ہیں وہاں دوسری طرف اسلام کو ملکیت کے متعلق اُن خرابیوں سے پاک رکھتے ہیں جو اشتراکی مساوات سے پیدا ہوتی ہیں اشتراکیت عوام سے لے کر حکومت کے سپرد کر دیتی ہے۔ لیکن قرآن کا نظام اُن کی دولت کو اپنی ضروریات کے لیے رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ اسلامی نظام میں فرد کو مٹا کر جماعت میں جذب نہیں کیا جاتا۔ لیکن افراد کے اندر جماعت کی صلاحیت پیدا کی جاتی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دولت کے متعلق فیصلہ کیا کہ:۔

لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۵۹/۷	جو لوگ تم میں مال دار ہیں یہ مال اُن میں ہی نہ دائر رہے۔

اور اس کے لیے زکوٰۃ کا حکم دیا۔ اس کے ذریعہ افراد اپنے ایثار واستقلال سے قوم کو مضبوط بناتے ہیں اور معیار سے زائد دولت جمع ہونے پر لازمی طور پہ ٹیکس ادا کرتے ہیں جو اُن غریب اور مفلوک

لوگوں کے کام آتا ہے جن کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے:۔

إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۔ ۹/۶۰	صدقات اللہ کی طرف سے مقرر کردہ فرض ہے ۔ فقرا کے لیے اور مساکین کے لیے اور جو زکوٰۃ وصول کرنے پر ہوں اور اُن کے لیے جن کی تالیف قلوب منظور ہو اور گردنیں آزاد کرانے اور قرضداروں کے لیے اور راہ خدا میں اور مسافروں کے لیے اللہ بہتر جاننے والا حکمت والا ہے ۔

زکوٰۃ اپنی افادیت اور جامعیت کے لحاظ سے اسلام کا بہت بھاری رکن ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے نماز اور زکوٰۃ کے احکام متعدد بار قرآن کریم میں اکٹھے بیان فرمائے ہیں مثلاً:۔

إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللّٰهَ قف ۹/۱۸	حقیقت میں اللہ کی مسجدوں کو وہی آباد رکھتا ہے ۔ جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لایا اور نماز پڑھتا اور زکوٰۃ دیتا رہا اور جو خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرا

زکوٰۃ سے پیدا شدہ مساوات اشتراکیت کی مساوات سے کس قدر بلند ہے اس سے قوم کی دولت کی محبت بھی کم ہوتی جاتی ہے ۔

حُبِّ دولت را فنا سازد زکوٰۃ
ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ
دل ز حَتّیٰ تُنْفِقُوْا محکم کند
زر فزاید الفت زر کم کند
این ہمہ اسباب استحکام تست
پختۂ محکم اگر اسلام تست

اہل قوت شو ز وردِ یا قوی
تا سوارِ اُشترِ خاکی شوی ، اسرار ۴۸

ہر سال با قاعدگی سے زکوٰۃ ادا کرنے سے جماعت کا توازن برقرار رہتا ہے حاجت مندوں اور غریبوں کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ بیکس انسانوں کو تنگ دستی سے نجات ملتی ہے اور قرض داروں کا قرض ادا ہو جاتا ہے۔ اسلامی معشیت کا یہ اصول آخرکار وہ دن لے آتا ہے کہ جہاں میں کوئی کسی کا محتاج نہیں رہتا ؎

کس نہ گردد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبین این است وبس

پس چہ باید کرد ۷۱

اس درجہ تک پہنچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام افراد جن پر زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہے۔ اس کو پورا کریں۔ اسی لیئے قرآن کریم کا ان لوگوں کے متعلق جو دولت جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے یہ فیصلہ ہے کہ انہیں دردناک عذاب دیا جائے گا۔

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ	اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے

؎ عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ تک اسلامی دنیا میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ زکوٰۃ دینے والے مال لے کر پھرتے تھے۔ لیکن لینے والے حاجت مند میسر نہ آتے تھے

الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ؏ ۹/۳۴	رہتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو (اے پیغمبر) اُن کو (روز قیامت کے) عذاب دردناک کی خبر سنا دو۔

اس کی وجہ صاف طور پر عیاں ہے کہ ایسے لوگوں نے اپنے جیسے انسانوں کو بھوک سے بلبلاتے دیکھا اور اُن کی مدد نہ کی یتیموں، بیواؤں اور بیکسوں کی چیخ و پکار سُنی۔ لیکن ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بلکہ اپنے مال و دولت میں مست ہو کر مظلوم انسانوں کی تکلیف کو دوبالا کرتے رہے اور اس طرح نظام عالم میں جو اصلاح وہ کر سکتے تھے۔ اُس سے غافل رہے حقیقت میں جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دیتا ہے وہ اپنے مال کو تمام برائیوں سے پاک و صاف کر لیتا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا ۹/۱۰۳	ان کے مال سے زکوٰۃ لے۔ کر تو اُن کو ظاہر و باطن میں پاک و صاف کرے۔

علامہ اقبال نے اسلام کی ان خوبیوں کو ابلیس کی زبان سے یوں بیان کیا ہے

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین

ارمغانِ حجاز ۲۲۵

سرمایہ داری کا خاتمہ کرنے اور ایک ہموار معاشرہ پیدا کرنے کے لیے اسلام نے صرف زکوٰۃ کا ہی طریق اختیار نہیں کیا بلکہ اصول وراثت میں بھی اس بات کو مدِ نظر رکھا۔ جائداد کا وارث صرف بڑے لڑکے کو نہیں بنایا گیا۔ بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ حصّوں میں تقسیم کیا اور عورتوں کو بھی حصّہ دار بنایا[1]

انہی اصولوں کے ماتحت دھوکہ یا بلا محنت حصولِ زر کو مردود قرار دیا اور کسبِ مال کے تمام ایسے ذرائع کو افضل بتایا۔ جن میں دیانت داری سے کام لیا جائے۔ تجارت۔ زراعت اور صنعت و حرفت کو پسند فرمایا اور آمدنی کے ایسے ذرائع کو ناجائز قرار دیا۔ جن سے سوسائٹی کے دوسرے افراد کو نقصان پہنچتا ہو۔ چوری۔ رشوت۔ قمار بازی اور جوا کی ممانعت کی۔ ملکہ لین دین کی تمام صورتیں جن سے جوے کا کچھ بھی احتمال ہو۔ ممنوع

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں قرآن حکیم [illegible]

قرار دیا۔ اسی طرح حرام چیزوں کی تجارت سے دولت کمانے اور بلیک مارکیٹ کو فروغ دینے والے طریقوں کو حرام قرار دیا۔ اشیاء ضرورت کو قیمتیں گراں کرنے کے لیے جمع کرنے اور روک رکھنے کے متعلق حدیث ہے:۔

مَنْ اِحْتَكَرَ فَهُوَ خَاطِئٌ	احتکار کرنے والا گنہگار ہے۔

اس کی تفصیل کے لیے شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیف حجۃ اللہ البالغۃ کی طرف رجوع کریں۔ جو صورتیں انہوں نے بیان کی ہیں۔ چند ایک یہ ہیں:۔

(۱) بیع مزابنہ۔ درخت پہ لگی ہوئی کھجوروں کو دوسری کھجوروں کی مقدار کے مقابلہ میں فروخت کرنا۔

(۲) بیع محاقلہ۔ کھڑی فصل کو غلہ کے عوض فروخت کرنا۔

(۳) بیع ملامسہ۔ کوئی شخص کہے کہ اگر میں تیرا کپڑا چھولوں تو فلاں چیز میرے نام بیع ہو جائے گی۔

(۴) بیع منابذہ۔ مشتری آنکھ بند کر کے اپنا کپڑا چیزوں کے ڈھیر یا جانوروں کے گلہ پہ پھینکے کپڑا جس پہ پڑ جائے وہ پہلے سے طے شدہ رقم کے عوض میں اس کی ہو جائے۔

(۵) بیع حصاۃ۔ کپڑے کی جگہ کوئی کنکر وغیرہ پھینکے اور بیع منابذہ کی طرح حاصل کرے۔

(۶) بیع مضامین۔ جانوروں کے ان بچوں کی بیع جو ابھی نر جانور کی پشت میں ہوں۔

(۷) بیع الملاقیح۔ جانوروں کے ان بچوں کی بیع جو ابھی شکم مادر میں ہوں۔

(۸) بیع حبل الحبلہ۔ جانوروں کے ان بچوں کی بیع جن کی ماں ابھی بطن مادر میں ہو۔ وغیرہ۔

اردو میں اس موضوع پر روشنی کے لئے دیکھیں۔ "اسلام کے معاشی نظریات" دستگیر رشید۔

سرمایہ داری کا ایک بڑا ہتھیار سود ہے۔ جس کے ذریعہ دولت مند غریب آدمی کو غریب تر کرتے ہیں اور خود ظلم کے ذریعہ اپنی دولت میں اضافہ کرتے ہیں لیکن اسلام انسان کو انسان کا گلا گھونٹ کر زندہ بننے سے روکتا ہے

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن! کس نداند لذتِ قرض حسن!
از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ آدمی درندہ بے دندان و چنگ

جاوید نامہ ۹۰

اسلام نے سود کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کھلی جنگ قرار دیا ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۲/۲۷۸

مسلمانو! اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ تو اللہ سے ڈرو اور جو سود لوگوں کے ذمے باقی ہے اس کو چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے ہوشیار ہو رہو۔

ان تمام احکام کا خلاصہ رسول اکرم صلعم کے اس ارشاد میں ہے جس کے ذریعہ طلب حلال کو افضل الاعمال قرار دیا۔

اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ الْكَسْبُ مِنَ الْحَلَالِ۔

حلال طریقہ سے روزی کمانا تمام اعمال میں افضل ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں ــــ

سرِ دیں صدقِ مقال اکلِ حلال خلوت و جلوت تماشائے جلال

حلال کی کمائی کے متعلقہ احکام پر عمل کیا جائے تو جماعت بے سبب وبال سے محفوظ رہتی ہے ؎

تا ندانی نکتۂ اکل حلال
بر جماعت زیستن گردد وبال
پس چہ باید کرد ۳۷

اس بحث سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اسلام نہ ملوکیت ہے اور نہ اشتراکیت۔ اور گو دونوں کی خوبیاں اس میں موجود ہیں لیکن دونوں کی برائیوں سے محفوظ ہے۔ ان ہر دو میں چند مشترک خرابیاں ایسی ہیں۔ جن کی وجہ سے انھیں قبول کرنا مشکل ہے۔ ہر دو آدمیت کو فریب دینے والے اور خدا سے ناآشنا کرنے والے ہیں۔ تن کو روشن لیکن دلوں کو تاریک کرتے ہیں۔ زنبور کی طرح گل کی پتی سے شہد نکال کر لے جاتے ہیں اور اسے بے رونق چھوڑ دیتے ہیں ؎

ہم ملوکیت بدن را فربہی است
سینۂ بے نور او از دل تہی است
مثل زنبورے کہ بر گل می چرد
برگ را بگذارد و شہدش برد
شاخ و برگ و رنگ و بوئے گل ہماں
بر جمالش نالۂ بلبل ہماں
از طلسم رنگ و بوئے او گذر
ترک صورت گوے و در معنی نگر
مرگ باطن گرچہ دیدن مشکل است
گل مخواں او را کہ در معنی گل است
ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب
ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
[illegible] این را خروج آں را خراج
در میان ایں دو سنگ آدم زجاج

این بہ علم و دین و فن آرد شکست — آں برد جاں را ز تن ناں را ز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل — ہر دو را تن روشن و تاریک دل
زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخم دلے انداختن (جاوید نامہ)

اسلام دولت و ثروت اور عزت کو اللہ تعالیٰ کے انعامات میں شمار کرتا ہے۔ لیکن سرمایہ داری کا مخالف ہے حصول مال کی سعی و کوشش کو پسند کرتا ہے لیکن اسے انسانیت کے لیے باعث ننگ یا غریبوں کا گلا کاٹنے کا ذریعہ نہیں بناتا۔ مختصر یہ کہ وہ حکومت بھی چاہتا ہے اور اخلاق بھی۔ سیاست کے ساتھ مذہب بھی اس کا لازمی جزو ہے حکومت پر جب تک مذہب و اخلاق کی پابندی نہ ہو۔ اس کا نتیجہ ہولناک تباہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر مذہب کا تعلق حکومت و سیاست سے نہ ہو تو وہ افراد کا پرائیویٹ معاملہ بن کر افراط و تفریط کا تختۂ مشق بن جاتا ہے۔

علامہ اقبال نے لکھا ہے "ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں۔ لیکن اس کے نظام سیاست کے بجائے اُن قومی نظامات کو اختیار کریں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن پاک میں اُن کا اظہار ہوا ہے محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں کہ اس کا تعلق صرف صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر اُن کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس

کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے۔ اسلام کے مذہبی نصب العین اُس کے معاشرتی نظام سے جو خود اُسی کا پیدا کردہ ہے الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں[1]

رسول اکرمؐ نے اسی لیے فرمایا کہ میرے دو لباس ہیں ایک فقر اور دوسرا جہاد۔ لی خرقتان الفقر والجہاد۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ یہ دونوں اکٹھے ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک دوسرے کو اپنے میں مدغم نہیں کرتا یہ دو دریا ہیں جو مل کر چلتے ہیں لیکن ملتے نہیں۔

مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ۙ بَیْنَہُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ ج

۵۵
۱۹ - ۲۰

چلائے دو دریا کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لگ رہے ہیں۔ لیکن درمیان ایک پردہ ہے (اس سے ایک دوسرے کی طرف) بڑھ نہیں سکتے

علامہ مرحوم نے رسول اکرمؐ کے فرمان اور قرآن کریم کے ارشاد کو بیان کرتے ہوئے لا یبغیان کی مثال لی خرقتان میں دی ہے ؎

خوشا آں دم برزخ لا یبغیان ء و باہم در نکتہ لی خرقتان،

مسافر ۳۱

موجودہ وقت میں تمام دنیا کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے گھبرا رہی ہے۔ یورپ اور امریکہ اس کو مشرق بعید میں روکنے سے ناکام رہے

[1] علامہ اقبال کا مضمون سیاست اسلام اور قومیت۔

ہیں اور آئے دن مختلف ممالک یہ خطرہ محسوس کرتے رہتے ہیں کہ ان کے ملک میں کمیونزم پھیل رہا ہے۔ اس کے سدباب کے لیے اس کے اسباب پر غور کرنا ضروری ہے۔ کمیونزم بھوک، بیکاری اور افلاس سے بڑھتا ہے۔ غریب آدمی یہ اعلان کرتے ہوئے کہ ہم کمیونزم کے مخالف ہیں غیر محسوس طور پر اس کی گود میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض انجمنیں اور ادارے بھی ایسے ہیں جو کمیونزم سے اپنی علیحدگی کا اعلان کرتے ہیں لیکن تخریب کے وہ پہلو عملی طور پر لیے ہوتے ہیں جو موجودہ کمیونزم کی جان ہیں اُن کے اعلان کسی منافقت پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ حقیقت میں وہ خود نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اسلامی نظام جس کا خاکہ ابھی پیش کیا گیا ہے۔ اس سیلاب کو روکنے کا ذریعہ ہے لیکن ضرورت عمل کی ہے اور ان غریب لوگوں کے افلاس کو دور کرنے کی ہے جو بھوک کی وجہ سے زندگی سے تنگ ہیں۔ اُن یتیم بچوں کی پرورش کی ہے۔ جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اُن کسانوں کی بہتری کی ہے جو زمینداری کا شکار ہو کر نیم فاقہ پر مجبور ہیں اور جن کی حالت یہ ہے کہ ؎

دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی ہے گِرو غیر، بدن بھی ہے گِرو غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

ضربِ کلیم ۱۵۲

بندۂ مزدور کو بھی خضر کے اس پیغام کی ضرورت ہے ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات!

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہو بانگِ درا ۲۹۷

اسلامی نظام میں ان تمام بیماریوں کا علاج موجود ہے اور اس کو عملاً رائج کرنے کے لیے حضرت عمر فاروق رضؓ کی مثال موجود ہے۔ جو راتوں کی خاموشی میں جب امیروں کی دنیا خوابِ خرگوش میں مست ہوتی ہے۔ غریبوں کی آہ دبکا سُننے کے لیے گھر سے نکل پڑتے اور حاجت مندوں کی ضروریات کو پورا کرتے اگر یہ نظام روزمرّہ کی زندگی میں عملی طور پر پیش کیا جائے تو سرمایہ فاقہ مست کو اپنے شیخ سے یہ شکایت نہ رہے کہ خدا جو شہ رگ سے نزدیک

ہے[1] شکم سے کے نزدیک کیوں نہیں ہے ؂

مریدے فاقہ مست گفت با شیخ　　کہ یزداں راز حالِ ما خبر نیست
بہ ما نزدیک تر از شہ رگِ ماست　　ولیکن از شکم نزدیک تر نیست!

ارمغان حجاز ۲۰

اگر ہم مغربی جمہوری نظام کا جائزہ نہ لیں تو ہماری یہ بحث نامکمل رہے گی کیونکہ موجودہ وقت میں مغربی جمہوریت کو ایسے نظام حکومت کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جو کامل ہے اور صدیوں کے تجربہ اور فکر کا نتیجہ ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ اس کا حال کچھ تفصیل سے بیان کیا جائے۔

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں یونانیوں نے اپنے ملک میں جمہوریت کو رائج کیا۔ لیکن اُن کا طرزِ حکومت نامکمل ہی رہا غلامی اُن کے تمدن کا ضروری جزو تھا۔ غلام کو آقا کے لیے ایسا ہی لازمی خیال کیا جاتا تھا۔ جیسے جان کے لیے جسم۔ غلام کو وہ زندہ ہتھیار تصور کرتے تھے اور ہتھیاروں کو بے جان غلام۔

موجودہ زمانہ میں جمہوریت کی ابتدا انقلاب فرانس سے ہوئی۔ فرانس کے لوگ خود مختار و مطلق العنان بادشاہوں کی حکومت سے تنگ تھے۔ امرا اور وزراء تمام کے تمام طاقت اور دولت کے نشہ میں چور عوام کو اپنے پاؤں تلے روند رہے تھے۔ عوام میں اتنی سکت نہ تھی کہ اس ظلم و استبداد کے خلاف آواز اُٹھا سکیں۔ فرانسیسی مفکر رُوسو (۱۷۷۸-۱۷۱۲) نے عوام کو بیدار کرنے

---

[1] وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔ $\frac{۵}{۱۶}$　　ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

میں اہم حصہ لیا اور اس کی تعلیم جدید جمہوری حکومتوں کی بنیاد بنی۔

جمہوریت کی موجودہ صورت میں عوام کو حکومت و سیاست میں منبع اقتدار تسلیم کیا جاتا ہے اور حکومت کا قیام کثرت رائے کا محتاج ہوتا ہے۔ اس طریق حکومت کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بہت سی خامیاں ایسی ہیں۔ جو رنگین پردوں میں چھپی رہتی ہیں۔ عوام مجبور ہوتے ہیں کہ وہ چند لوگوں کو انتخاب کر کے حکومت کے لیے مقرر کریں قطع نظر اس کے کہ بعض اوقات انتخاب میں غلط قسم کے لوگ دولت یا پروپگنڈہ کے اثر سے کامیاب ہو جاتے ہیں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ منتخب ممبر ایک پارٹی یا گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں اور ہر معاملہ میں اپنی رائے اپنی پارٹی کے ساتھ دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ انتخاب کی یہ صورت اور بھی خطرناک ہوتی ہے جب ووٹ دینے والے عوام بے علم اور بے سمجھ ہوں۔

جمہوری نظام میں پارٹی طریق پر جو فیصلہ کیا جاتا ہے وہ صحیح معنوں میں تمام قوم کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ تعداد غالب کا فیصلہ ہوتا ہے یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ نصف افراد قوم سے صرف ایک رائے کی بیشی سے کوئی فیصلہ حاصل کیا جائے اس نظام کے ماتحت وہ بھی تمام قوم کا فیصلہ ہی تصور کیا جائے گا۔

ایک اور خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ اکثریت والی تعداد یہ کوشش رکھتی ہے کہ اپنے اقتدار کو عدم نہ پہنچنے دے وہ کم تعداد والے لوگوں کو ہر طریق سے اپنا مطیع و فرمانبردار رکھنے کی سعی کرتے ہیں اور اکثر اوقات اس میں

کامیاب رہتے ہیں۔ کیونکہ اکثریت ان کے ساتھ ہوتی ہے اور اکثریت کی رائے ہی قانون کی حیثیت رکھتی ہے اس طریق پر کثرت پھر اپنی قوت وطاقت کے بل پر اُسی خود مختاری کو اپنا شیوہ بنا لیتی ہے۔ جس کے علاج کے لیے جمہوری نظام کو شروع کیا جاتا ہے۔

رُوسو خود بھی اس نظام کی کمزوریوں سے واقف تھا۔ شاید اُس کی نگاہیں زمانۂ مستقبل میں تمام قسم کی فرقہ بندیوں۔ سازشوں اور غیر اخلاقی تمدن کا تسلط قائم ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ جس سے متاثر ہو کر اُس نے لکھا کہ اگر دنیا میں کوئی قوم دیوتاؤں کی ہوتی تو اُس کے لیے جمہوری طرزِ حکومت بہت مناسب ہوتا، افلاطون کی 'ری پبلک' کے خاکہ سے لے کر آج تک کوئی مغربی حکومت حقیقی جمہوریت قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ جس میں عوام کے حقوق بالکل محفوظ ہوں اور جس کی بنیاد نیکی پر ہو۔ والٹیر نے اپنے زمانہ میں لکھا ہے کہ ہمارے نوجوان خوش قسمت ہیں۔ کیونکہ وہ اُس خواب کی تعبیر دیکھیں گے۔ جس سے نئی اور بہترین دنیا کی تخلیق ہو رہی ہے۔ لیکن جلدی ہی یہ بات روشن ہو گئی کہ فرانس کے لوگ جو مساوات کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے تو اصل آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ روسو نے عوام کو بادشاہوں کی مطلق العنانی سے آزاد کرانے کی سکیم تیار کی۔ لیکن اُس کا پیدا کیا ہوا انقلاب آخر کار اُسی ظلم و تعدی میں ختم ہوا جس کو دُور کرنے کے لیے اتنا خون بہایا گیا تھا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذرا سی مخالفت پر بھی

انسانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ بیسٹل کے مشہور قلعہ سے پہلے تو ان تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ جو ملوکیت کا نشانہ بن کر اپنی زندگی کے دن آہنی سلاخوں کے پیچھے گزار رہے تھے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اتنی ہی تعداد نئے قیدیوں کی پیدا ہو گئی۔ جو نئی جمہوریت کا شکار تھے۔ غرضیکہ ایک بار پھر ہر طرف نفرت و حقارت کے وہی جذبات موجزن نظر آنے لگے۔ دیو استبداد کو پھر وہی مواقع میسر آ گئے۔ گو اب کی دفعہ وہ جمہوریت کی خوبصورت قبا اوڑھ کر انسانیت کے سامنے آیا ہے

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو　　　بانگ درا　۲۹۶

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں اس کا ایک مشیر جمہوریت کے اسی پہلو کو یوں ظاہر کرتا ہے

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر! ارمغان حجاز ۲۱۷

یہ آزادی صرف ظاہری ہے ؎

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

مغربی جمہوریت کا مقابلہ اسلامی نظام حکومت سے کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام لازمی طور پر غریبوں کا ہمنوا ہے اور جمہور کو پوری اہمیت دیتا ہے۔ علامہ اقبال نے ''فرمانِ خدا'' کے عنوان سے نظم لکھی ہے جس میں اللہ تعالےٰ فرشتوں کو یوں خطاب فرماتا ہے ؎

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے　　کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ　　جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی　　اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو　　بال جبریل ۱۴۹

لیکن جمہور کی یہ حکومت ایک مقررہ ضابطہ کے مطابق ہوتی ہے۔ اسلامی جمہوریت کا مغرب کے جمہوری نظام سے بنیادی اختلاف یہ ہے کہ مغرب

نظام میں حکومت خواہ کسی قسم کی ہو۔ اُس کا اقتدار و حاکمیت کا حق انسانوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کے نظام کی بنیاد اس پر ہے کہ حاکمیت و اقتدار کا حق خدا کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔

اسلام کی بنیاد توحید پر ہے۔ اس کے نظام سیاست میں بھی اِس بنیاد کو قائم رکھا جاتا ہے۔ "نظام سیاست کی حیثیت سے اسلام اسی اصول کو نوع انسانی کی جذباتی اور فکری زندگی میں ایک حقیقی عنصر بنانے کا عملی طریق ہے اس میں اطاعت کا مطالبہ خدا کی ذات کے لیے ہوتا ہے نہ کہ تخت کے لیے"[1] اس بنا پر اسلامی نظام حکومت میں مختلف طبقے ایک دوسرے کے رقیب یا مخالف نہیں ہوتے اور نہ ہی ایسی پارٹی کی تشکیل ہوتی ہے جو ہر وقت ایک دوسرے کی حمایت کرنے پر مجبور ہو۔ حکومت کے قوی ہونے کے لیے باگ ڈور ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جسے قوم منتخب کرتی ہے اور جو اسلامی جماعت کی صفات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ حکومت امانت کے طور پر اُس کے سپرد ہوتی ہے۔ حاکم کے لیے امین ہونا ضروری ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ حکومت امانت ہے۔ قیامت کے دن یہ ندامت ہوگی۔ سوائے اُس کے جس نے حکومت حق دار ہو کر لی اور پھر اپنے فرائض کو صحیح طور پر ادا کیا۔ حاکم کے دل میں ہر وقت اللہ تعالےٰ کا ڈر رہنا ضروری ہے۔ وہ خدا کے احکام کے مقابلہ میں مالی فائدہ، کنبہ پروری یا لوگوں کے ڈر کی پروا نہیں کرتا۔

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا	لوگوں سے نہ ڈرو۔ اور ہمارا ہی ڈر مانو اور ہماری آیتوں کے معاوضے

---

[1] خطبات اقبال صفحہ ۱۴۷

ثَمَنًا قَلِيْلًاؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ .	میں (دنیا کے) ناچیز فائدے نہ لو اور جو خدا کی اتاری ہوئی (کتاب) کے مطابق حکم نہ دے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

ان صریح احکام کی موجودگی میں اسلامی حکومت میں ذاتی اغراض جذبہ اقتدار یا حب جاہ و مال کی پرورش نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی کسی ایسی پارٹی کی حکومت کو فروغ ہو سکتا ہے جس میں معیار حق و صداقت نہیں۔ بلکہ پارٹی کا مفاد ہو اور جہاں صرف اکثریت کو معیار حق قرار دیا جائے۔ حالانکہ بقول اقبال مغز دو صد خر سے فکر انسانی کی تو لازم نہیں ہے ؎

متاع معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی؟
زموراں شوخیٔ طبع سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

پیام مشرق ۱۵۸

اسلام ظنیات کا پیرو نہیں۔ اس کے لئے کثرت کی پیروی نہیں بلکہ حق کا اتباع ضروری ہے۔

وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِؕ	اور (اے پیغمبر) اگر تم ان لوگوں کا کہا مانو جو آج زمین میں سب سے زیادہ ہیں تو وہ تمہیں خدا کی راہ سے بھٹکا دیں

إِنْ يَتَّبِعُوْنَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۔ ۶/۱۱۷

(وہ خود سب بھٹکے ہوئے ہیں) وہ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور صرف اٹکل (قیاس آرائی) سے کام لیتے ہیں۔

مغربی جمہوریت میں اکثریت کے سامنے (جو صاحب اقتدار ہوتی ہے) اور کوئی ایسا قانون نہیں ہوتا جسے وہ تبدیل نہ کرسکیں۔ تمام کا تمام ضابطہ ہی ایسا ہے۔ جو ان کی مرضی کے مطابق تبدیل ہو سکتا ہے۔ اس کی کوئی مقررہ منزل نہیں ہوتی۔ ہر پارٹی کے اقتدار کے ساتھ اس کا مطمح نظر بھی بدل جاتا ہے۔ اسلامی نظام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک ایسا ضابطۂ قانون موجود ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی اکثریت بھی تبدیل کرنے سے قاصر ہے۔ تمام انسانی قوانین اسی ضابطہ کے ماتحت ہوتے ہیں اور اسی کے تحت میں آئینی حکومت کا تحفظ بھی کیا جاتا ہے ۔۔۔۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۳/۱۵۸ نیز وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ۴۲/۳۸

اسلام میں اگر سچائی کی طرف قلت ہو تو اُسے چھوڑا نہیں جاسکتا اور نہ باطل کو اس کے لیے اختیار کیا جاسکتا ہے کہ اس کے حق میں اکثریت ہے:۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۵/۱۰۰

(ان سے) کہو کہ ناپاک اور طیب ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ تجھ کو ناپاک کی کثرت بھلی ہی معلوم ہو اے عقل والو اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اسلامی نظریہ کے مطابق قانون وہ ہے جو حق ہو۔اس کے برعکس مغرب میں حق وہ ہے جو قانون ہو۔اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے ؎

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش!
ہرچند کہ دانا اِسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ضربِ کلیم ۱۵۰

مغربی جمہوریت کی طرح اسلامی حکومت اقتصادی مواقع کی وسعت سے پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی دولت کو معیارِ قابلیت سمجھا جاتا ہے یہاں فضیلت علم، عمل اور تقوے کو حاصل ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ؕ قَالُوٓا أَنّٰى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي	اور اُن کے پیغمبر نے اُن سے کہا کہ اللہ نے (تمھاری درخواست کے مطابق) طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔اس پر وہ کہنے لگے کہ اس کو ہم پر کیونکر حکومت مل سکتی ہے حالانکہ اس سے تو حکومت کے ہم ہی زیادہ حقدار ہیں کہ اس کو تو مال و دولت کے اعتبار سے بھی کچھ ایسی فارغ البالی نصیب نہیں پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے تم پر

له سنبھل

الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۲۴۷/۲

حکمرانی کے لیے اسی کو پسند فرمایا ہے اور مال ہیں ہیں تو علم اور جسم میں اس کو فراخی دی ہے اللہ اپنا ملک جس کو چاہے دے اور اللہ بڑی گنجائش والا اور سب کے حال سے واقف ہے۔

مسلمان حاکم میں آمریت پیدا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ہر مسلمان اُس پر اعتراض کر سکتا ہے۔ اس کے متعلق حضرت عمرؓ کی خلافت کا مشہور واقعہ ہے کہ آپ خطبہ کے لیے اُٹھے تو ایک مسلمان نے کہا "امیر المومنین ٹھہریئے ہم آپ کی بات نہ سنیں گے۔" آپ نے وجہ دریافت فرمائی تو اُس شخص نے کہا کہ "آپ نے ملک یمن کے مال غنیمت میں زیادتی کی ہے۔ وہاں سے جتنا کپڑا ہر مسلمان کو ملا ہے۔ اُس سے آپ جیسے دراز قامت شخص کا کُرتہ نہیں بن سکتا اور آپ اُسی کپڑے سے تیار کی ہوئی قمیض زیب تن کئے ہوئے ہیں۔" امیر المومنین نے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ "میں نے اپنے حصہ کی چادر امیر المومنین عمرؓ کو دے دی ہے۔" معترض کی تسلی ہو گئی اور اُس نے عرض کیا کہ "ہم مال و جان آپ کی تعمیل حکم کے لیے حاضر ہیں۔"

اسلامی حکومت ایک لمحہ کے لیے بھی شریعت سے جدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ شریعت کی پاسبان ہوتی ہے اصل مقصود یہی ہے۔ سلطنت اور قوت اُس شریعت کے قیام کے لیے خادم اور پاسبان ہیں اور شریعت سلطنت کو فساد و تباہی سے بچانے کا ذریعہ ہے۔ مسلمان کے سیاسی نظام کے لئے

قرآن اور تلوار دونوں ضروری ہیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے تو دوسرے میں قرآن بھی موجود رہتا ہے۔ یعنی دین و دنیا کی آمیزش سے ہی اس کا نظام مکمل ہوتا ہے علامہ اقبال نے اس نکتہ کو جاوید نامہ میں بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ میں نے جنت میں جواہرات کا بنا ہوا ایک محل دیکھا۔ جو اپنی چمک دمک میں آفتاب سے بھی روشن تھا اور جس کے دروازے پر حوریں احرام باندھے موجود تھیں۔ سیر رومی اقبال کو بتاتے ہیں کہ یہ محل شرف النساء کا ہے۔ (جو نواب عبدالصمد خاں[1] گورنر پنجاب کی پوتی تھی) اور اس کے مزار کی برکت سے لاہور کی سرزمین بھی آسمان بن گئی ہے ۔

مرغ بامش با ملائک ہم نواست	گفت این کاشانۂ شرف النساست
ہیچ مادر این چنین دختر نزاد	قلزم ما این چنین گوہر نزاد
کس نداند راز او را در جہاں	خاک لاہور از مزارش آسماں
حاکم پنجاب را چشم و چراغ	آن سراپا ذوق و شوق و درد و داغ

اس کو یہ اوج اس وجہ سے ملا ہے کہ وہ زندگی بھر تلاوت قرآن سے غافل نہ ہوئی اور تلوار کو کمر میں لگائے رکھا ہے

از تلاوت یک نفس فارغ نبود	تا ز قرآن پاک می سوزد وجود

[1] نواب عبدالصمد خاں اور لاہور کے نواب زکریا خاں کی قبریں بیگم پورہ (متصل پنجاب انجینئرنگ کالج لاہور) میں ایک چبوترہ پر تھیں۔ اس عمارتیں سکھوں کے زمانہ میں برباد ہو گئیں۔ چبوترہ موجود ہے۔ لیکن احاطہ میں زمیندار آباد ہیں اور انھوں نے اس چبوترہ کو بھی ایک مکان کے محاذ میں شامل کر رکھا ہے۔

در کمر تیغ دو رُو قرآں بدست — تن بدن ہوش و حواس اللہ مست
خلوت و شمشیر و قرآن و نماز — اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز

قرآن و تلوار کا حقیقی راز اُس نے دمِ واپسیں اپنی ماں سے وصیت کرتے ہوئے یوں بیان کیا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے محافظ اور کائنات زندگی کے لیے محور ہیں۔ قرآن میں باعزت زندگی کے لیے ضابطہ موجود ہے تو تلوار اُس ضابطۂ حیات کو زندہ و برقرار رکھنے کی ذمہ دار ہے۔ وہ دین کو طاغوتی قوتوں اور مخالف گروہوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

بر لبِ او چوں دمِ آخر رسید — سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از رازِ من داری خبر — سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند — کائناتِ زندگی را محور اند

اُس نے اپنے مقبرہ کے لیے ماں سے گنبد و قندیل کی آرزو نہیں کی۔ بلکہ یہی کہا کہ تیغ و قرآن کو مجھ سے جدا نہ کرنا[1]۔ کیونکہ دین کے لیے یہی سامان کافی ہے

وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن — تیغ و قرآں را جدا از من مکن
دل بآں حرفے کہ می گویم بنہ — قبرِ من بے گنبد و قندیل بہ

[1] شرف النساء کی وصیت کے مطابق اسی چبوترہ پر جہاں وہ روزانہ قرآن کی تلاوت کرتی تھی اُسے دفن کیا گیا اور قرآن اور تلوار کو وہاں ہی محفوظ کر دیا گیا۔ سکھوں نے اپنے زمانہ میں شمشیر و قرآن کو نکال لیا اور بقول اقبال

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد (جاوید نامہ ۱۸۳)

مومناں را تیغ با قرآں بس است

تربت مارا ہمیں ساماں بس است جاوید نامہ ۱۸۲

اس سے ظاہر ہوا کہ حکومت وہی درست ہے جو قرآن کے مطابق ہو۔
وہ لوگ جو شریعتِ قرآنی کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے۔ ظالم ہیں:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ۵/۴۵	جو خدا کی نازل کی ہوئی بات کے مطابق فیصلہ نہ کریں۔ وہی ظالم ہیں۔

خدا کے قانون پر عمل پیرا ہو کر حکومتیں ایک ایسے ہمہ گیر تمدن کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ جس میں افراد قوم کی بہتری کے لیے اجتماعی طور پر سرگرم عمل رہتے ہیں اور اخلاقی فلاح و بہبود کے ساتھ مادی خوشحالی اور سیاسی بلندی بھی حاصل ہوتی ہے۔ مغرب کا تمدن جتنا غیر مستقل ہے۔ اسلامی تمدن اتنا ہی پائدار اور مستقل ہے تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ کوئی تمدن جو مذہب و اخلاق سے بیگانہ رہا مستقل حیثیت اختیار نہ کر سکا۔ رُوسو کے انقلاب کی ناکامی کے اسباب میں انقلاب آفریدہ کے اپنے کمزور اخلاق کا بھی نمایاں حصہ تھا۔ وہ اخلاقی لحاظ سے بہت پست تھا۔ جس کی شہادت اُس کی اپنی تحریروں سے ملتی ہے جن میں "اعتراف"[1] زیادہ مشہور ہے۔ داعی انقلاب اگر خود زیورِ اخلاق سے مزین ہوتا تو فرانس کی تاریخ غالباً اس دہشت انگیزی سے پاک ہوتی جس کی وجہ سے اس کا دامن داغدار ہے۔
اسی طرح حکمائے یونان نے بھی فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی لیکن

[1] Confessions

اخلاق کے اسرار و رموز اُن کی درسگاہوں کی حدود سے باہر نہ جا سکے اور افراد کا اخلاقی معیار بلند نہ ہُوا۔ اس کے لیے اگر ہم سقراط کی زندگی پر ایک نظر ڈالیں تو وجہ عیاں ہو جاتی ہے۔ وہ خود بازار کی فاحشہ عورتوں سے تعلق رکھتا اور اُن میں سے ایک کے فروغ کے لیے کوشاں رہتا تھا اور یہی حال یونان کے دوسرے حکما کا تھا۔

افلاطون کو جب ۳۸۷ ق م میں سسلی کے دارالسلطنت میں سیاسی نظام کی تشکیل کا عملی موقعہ ملا تو اُس نے خیال کیا کہ اب وہ اپنے خیالات کی دنیا کے مطابق ایک بے مثل سلطنت قائم کر کے دکھا سکے گا۔ لیکن جلدی ہی اُس کی اُمیدوں کا خاتمہ ہو گیا۔ جب بادشاہ کو یہ معلوم ہُوا کہ اُس کے نظام پر عمل پیرا ہونا مشکل ہے۔ نتیجہ باہمی ناچاقی ہُوا اور بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ نے اُسے غلام بنا کر فروخت کر دیا۔ جس سے اُس کے ایک شاگرد و دوست نے اُسے آزاد کرایا۔ مقصد یہ واضح کرنے کا ہے کہ اخلاقی نظام جب تک عملی طور پر سیاسی زندگی میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کی کوئی وقعت نہیں۔ اسلام نے اخلاقی قدروں کو اپنے نظامِ سیاست میں شامل کر کے دنیا کے سامنے اُس بے مثل نظام کا نقشہ پیش کر دیا جس کے دیکھنے کی افلاطون کو تمنا رہی لیکن یہاں داعیِ انقلاب کی معصوم زندگی کا استدلال بھی لوگوں نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

لَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا | (اے قریش۔ ہجرت سے) پہلے بھی

مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ ۱۶/۱۵	ہیں تم میں مدت دراز تک زندگی بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم نہیں سمجھتے۔

یہی وجہ ہے کہ اس نظام میں مغرب کی نفرت ورقابت کی جگہ اتحاد اور پیوستگی ہے۔ مغرب میں نفسانیت ہے اس میں انسانیت۔ مغرب کے پاس جنگوں کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ اور اس میں امن کا پیغام ہے۔ وہاں طاقت و حکومت کا نتیجہ ہلاکت و تباہی میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں مکمل سکون اور پرامن خدمت میں۔ مغرب نے مادی قوت کو اپنا منتہائے نظر بنا لیا اور اس کی وجہ سے انھیں بے پناہ قوت حاصل ہوئی۔ ایٹم بم سے وہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے گرد راہ کی طرح اڑا سکتے ہیں۔ لیکن اس مادی طاقت نے انھیں روحانی اور اخلاقی لحاظ سے ترقی نہیں کرنے دی ؎

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات — بال جبریل ۱۴۷

موجودہ دور کی مادی ترقی کے خوفناک نتائج کے متعلق پروفیسر جوڈ۔ سپنگلر، پسکال اور دیگر مصنفین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یورپ میں سکون و اطمینان کے فقدان پہ تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر جوڈ نے لکھا ہے۔ کہ" اس زمانہ میں مشین کی بے پناہ قوت سے انسان چاہے تو سمندر کو پھاڑ دے۔ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ آسمان اس کے سامنے گرد ہے اور کائنات سرنگوں۔ لیکن اس قوت کے باوجود انسان کو سکون نصیب نہیں۔ انسان نے جو قوت ہزاروں سال کی کوشش سے حاصل

ہے وہ اب اس کے بس سے نکل گئی ہے وہ طاقت اب حاکم ہے اور انسان محکوم یہ قوت بے قابو ہو کر انسان کی ہلاکت کے درپے ہے۔ اگر اس پہ قابو حاصل نہ ہو تو انسانیت کا انجام اچھا معلوم نہیں دیتا۔

"اس میں شک نہیں کہ انسان قدرت کی تسخیر میں اپنے آباو اجداد سے آگے بڑھ گیا ہے۔ لیکن اخلاق وسیاست میں وہ اب بھی وہاں ہی ہے۔ جہاں ہزاروں سال پہلے یونان قدیم کے باشندے تھے۔ مادی ترقی میں تو ہم بڑھ گئے ہیں۔ لیکن روحانی واخلاقی لحاظ سے کوئی ترقی نہیں کی" نوجوان مذہب سے برگشتہ اور اخلاقی ضابطہ سے باغی ہیں۔ اُن کے سامنے کوئی اعلےٰ نصب العین نہیں۔ زندگی میں عشرت امروزہی اُن کا اصول ہے۔ اب یہ نظریہ قائم ہو گیا ہے کہ آج تو کھا پی لو۔ کل تمہیں مرنا ہے یہ اس دور کی سب سے بڑی لعنت ہے اور سپنگلر کے الفاظ میں موجودہ کلچر کی موت کا پیش خیمہ ہے جو کچھ آخر میں روما کے ساتھ ہوا وہی انجام یورپ کا ہوگا!

علامہ اقبال نے یورپ کے نوجوان کا نقشہ یوں کھینچا ہے:۔

"وہ اپنے افکار کی دنیا میں اپنی ذات کے خلاف اور سیاسی دنیا میں دوسروں کے خلاف نبرد آزما رہتا ہے۔ وہ نہ ہی تو اپنی سرکشی کو ضبط کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی زر پرستی کی پیاس بجھا سکتا ہے اور یہ چیزیں اُس کے تمام بلند مقاصد کا خون کر رہی ہیں اور ان سے ایسی کیفیت پیدا ہو رہی ہے کہ وہ زندگی سے بیزار ہو گیا ہے۔ وہ پُر فریب مناظر میں کھو کر اپنی ذات کی گہرائیوں سے ناواقف ہو چکا ہے۔ مادہ پرستی کی دوڑ میں اُس کی قوت

پہ وہ تاریخ گر چکا ہے۔ جسے ہکسلے کی نگاہ نے پہچانا اور اس پر اظہار تاسف کیا تھا"۔[1]

مغربی فلاسفر پیکال نے لکھا ہے کہ "انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش شروع کر دیتا ہے۔ جب اچھے نصب العین سامنے نہ ہوں تو برائی کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ یورپ کے لیے اس دلدل سے نکلنے کا یہی راستہ ہے کہ وہ بے یقینی کی جگہ یقین اور ایمان پیدا کرے اور نئی قدریں اور اخلاقی ضابطے پیدا کرے"۔

برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ "مذہب تو سائنس کو پہلے ہی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ لیکن جو لوگ اس پر یقین رکھتے تھے وہ بھی اب مایوس ہو چکے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے مذاہب کی طرح سائنس بھی اب اقتدار کا ذریعہ بن گئی ہے"۔[2] اقبال نے اسی لیے کہا ہے ؎

اللہ کو پامردئ مومن پہ بھروسا ‏ ‏ ‏ ‏ ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

ارمغان حجاز ۲۲۰

ایچ جی ویلز نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "طاقت اور قوت تو موجود ہے۔ لیکن اس کا صحیح مصرف نہیں ہے نوجوانوں کی امنگوں اور آرزوؤں کو بروئے کار لانے کے لیے کوئی بلند نصب العین نہیں۔ ایک

---

[1] خطبات اقبال صفحہ ۱۷۷

[2] Let the People think by Burtrand Russell

طرف قوّت کی زیادتی ہے تو دوسری طرف اخلاق کی اتنی ہی کمی ہے"۔
ایک اور مصنّف افسوس کرتا ہے کہ قوّت و اقتدار کا تخیّل اب بھی وہی ہے جو فرعون کا تھا اور دولت کے حصول اور خرچ کرنے کا نظریہ بھی قارون کا ہی ہے جس کے مطابق ہم اسے ذاتی اغراض اور عیش پسندی کے لیے استعمال کرتے ہیں لے

یہ اقتباس ظاہر کرتے ہیں کہ یورپ کے مفکرین بھی اس امر پر متفق ہیں کہ طاقت اور قوّت کا ایسا مصرف لازمی ہے جس میں اخلاقی ضابطے کی پابندی ہو۔ یہ مفکر ابن تیمیہ کے ان الفاظ پر متفق ہو رہے ہیں کہ اگر سلطنت نیکی سے اور نیکی سلطنت سے الگ ہو جائے تو بنی نوع انسان کے حالات بگڑ جاتے ہیں۔

لیکن جو چیز مغرب کے تمدّن میں مفقود ہے اور جس کی اُس کو تلاش ہے وہ اسلام میں موجود ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نظر کو دانشِ افرنگ کا جلوہ خیرہ نہ کر سکا ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف — بال جبریل ۶۱

ہر مسلمان کے لیے اس حال سے بچنا ضروری ہے ؎

لے The Prospects of Civilisation
by Alfred Zimein

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائرکِ بلند بال دانہ و دام سے گزر

کر بلاغت تیری ضربِ الحمد سے کشادِ شرق و غرب
تیغِ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر

مردِ مسلمان کے لیے مغرب کی تقلید نہ صرف غیر ضروری بلکہ ضرر رساں ہے۔ کیونکہ ؎

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے بالِ جبریل ۵۲

مغرب کے سرابِ رنگ و بو کو گلستان سمجھنے والوں کو حقیقت سے آگاہ کیا ہے ؎

ترا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ | کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر!
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی | فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر!

ضربِ کلیم ۲۸

ان کے سبق حاصل کرنے کے لیے اپنا تجربہ بیان فرمایا ہے ؎

بے اندیشہ خانۂ مغرب چشیدم | بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم با نکویانِ فرنگی | ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

ارمغانِ حجاز ۶۳

افرادِ ملّت

نہیں مقام کی خوگر طبیعت آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر — ضربِ کلیم

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ کسی مستقل و پائندہ نظامِ زندگی کے لیے افراد اور جماعت دونوں ضروری ہیں اور اس کے لیے انفرادی و اجتماعی طریق کار کا تعین لازمی ہے۔ گذشتہ باب میں ہم نے یہ دیکھا کہ اسلام میں نہ تو افراد کو جماعت میں ایسا ضم کیا جاتا ہے۔ کہ اُن کی ہستی ہی نہ رہے اور نہ ہی اُنھیں اتنا اقتدار دیا جاتا ہے کہ وہ آزاد مطلق ہو کر جماعت کے لیے وبال کا باعث بن جائیں۔ انفرادی نشوونما ضروری ہے لیکن مقصود بالذات نہیں مقصد اُس نظام کی تقویت ہوتا ہے۔ جو افراد و قوم دونوں کے لیے زندگی بخش ہو۔ یہ بالکل اس طرح ہوتا ہے۔ جیسے ایک قافلہ اپنی منزل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس میں ہر شخص کا علیحدہ ذاتی وجود قائم ہوتا ہے اور قافلہ کے ساتھ ہم سفر بھی رہتا ہے۔ یہی حالت زندگی کے قافلہ کی ہے ؎

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است — اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ رو

جاوید نامہ ۲۳

اس باب میں ہم دیکھیں گے کہ افراد کس طرح اپنا علیحدہ وجود محفوظ رکھ کر زندگی کے قافلہ میں اس کے ساتھ رفتار قائم رکھ سکتے ہیں اور اس سے آئندہ باب میں نظام کی اجتماعی حیثیت پر بحث کریں گے[1] ہمارا مدعا یہ معلوم کرنے کا ہے کہ افراد کی خودی میں کس طرح ایسی پختگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ جس سے نظام کی اجتماعی حیثیت مضبوط ہو جائے۔

روزمرّہ کے مشاہدات میں ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز خود نمائی میں محو ہے اور اپنے ذوقِ نمود میں بڑھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے ؎

ہر چیز ہے محو خود نمائی　　ہر ذرہ شہید کبریائی!
بے ذوقِ نمود زندگی موت　　تعمیرِ خودی میں ہے خدائی!

بال جبریل ۷۹

شبنم کا قطرہ اور پھول بھی ذوقِ نمود رکھتے ہیں اور سَو پردے پھاڑ کر اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں ؎

من از فلک افتادہ تو از خاک دمیدی
از ذوقِ نمود است دمیدی کہ چکیدنی
در شاخ تپیدی
صد پردہ دریدی
بر خویش رسیدی

پیام مشرق ۱۴۰

غرضیکہ ہر ذرہ جوشِ نمود سے سرشار ہے ؎

[1] اس بحث کے لیے مصنف کی دوسری کتاب کا انتظار فرمائیں۔

چہ لذّت یارب اندر ہست و بود است
دل ہر ذرّہ در جوشِ نمود است
شگافد شاخ را چوں غنچۂ گل
تبسّم ریز از ذوقِ وجود است

پیام مشرق ۲۱

جس قدر کسی چیز میں استواری ہوتی ہے۔ اسی نسبت سے وہ اپنے نمود میں کامیاب ہوتی ہے ؎

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است
پس بقدرِ استواری زندگی است اسرار ۱۴

اس کے برخلاف کائنات کی ہر وہ شے جو ذوقِ نمو کو کھو دیتی ہے کمزور ہو کر اپنی ہستی کو مٹا لیتی ہے قطرۂ آب جب استواری پکڑتا ہے تو اس کی لے مایہ ہستی گوہر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سبزہ جب اُگنے کی طاقت پیدا کرتا ہے تو سینۂ گلشن کو چیر کر باہر آ جاتا ہے اسی طرح جو ٹے زلیت قلزم میں بدل جاتی ہے لیکن پہاڑ جب استواری کھو بیٹھتا ہے تو ریگِ رواں بن کر صحرا میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ زمین چاند اور سورج میں بھی ان کی استواری کی نسبت سے ان کے استحکام میں فرق صاف دکھائی دیتا ہے۔ چاند زمین کے طوافِ پیہم سے فرصت نہیں پاتا۔ لیکن سورج جو زیادہ محکم ہے۔ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے اور زمین اس کے گرد گھومنے پر مجبور ہے ؎

قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند | ہستیٔ بے مایہ را گوہر کند
سبزہ چوں تاب دمید از خویش یافت | ہمتِ او سینۂ گلشن شگافت
بادہ از ضعفِ خودی بے پیکر است | پیکرش منت پذیرِ ساغر است
کوہ چوں از خود رود صحرا شود | شکوہ سنج جوششِ دریا شود
چوں زمیں بر ہستیٔ خود محکم است | ماہ پابندِ طوافِ پیہم است
ہستیٔ مہر از زمیں محکم تر است | پس زمیں مسحورِ چشمِ خاور است

چوں خودی آرد بہم نیروئے زلیست
می کشاید قلزمے از جوئے زلیست — اسرار ۱۵

لیکن ان چیزوں میں 'انا' یا ذہن کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ احساس انسانیت کے جامہ میں آکر پیدا ہوتا ہے۔ جہاں مرکزِ حیات الغو یا نخفس ہو جاتا ہے۔ علم نفسیات کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انسان میں اپنی شخصیت کا احساس بچپن سے ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ بچے چھوٹی عمر سے ہی اپنے گرد و پیش کے متعلق سوال کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور اس قسم کے سوال دریافت کرتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ کیسے اور کیوں ہے؟ غرضیکہ ایک پیہم جستجو ہوتی ہے جس میں وہ مصروف رہتے ہیں ؎

کودکے را دیدی اے بالغ نظر | کو بود از معنیٔ خود بے خبر
نا شناس دور و نزدیک آنچناں | ماہ را خواہد کہ بر گیرد عناں
از ہمہ بیگانہ آں مامک پرست | گریہ مست و شیر مست و خواب مست
زیر و بم را گوشِ او در گیر نیست | نغمہ اش جز شورشِ زنجیر نیست

سادہ و دو شیرہ افکارش ہنوز   چوں گہر پاکیزہ گفتارش ہنوز
جستجو سرمایۂ پندارِ او
از چرا چوں کے کجا گفتارِ او   رموز ۱۲۹

اُس وقت بچے کا فکر خام ہوتا ہے اور نو گفتار کی مانند جو ابھی پر کٹ ہو رہا ہو۔ لیکن اُس کی پیہم جستجو کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دن آتا ہے جب وہ غیر جوئی و غیر بینی سے سوئے خویش وا بیں ہوتا ہے جب وہ اپنے ہی کسی سوال کے جواب میں اپنے وجود کی اہمیت کو پا جاتا ہے اور اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے کہ "میں ہوں" ؎

چشم گیرایش فتد بر خویشتن
دستکے بر سینہ می گوید کہ "من"   رموز ۱۰۰

نفسیاتی لحاظ سے حقیقت وہی ہے جو اپنے حقیقت ہونے کا شعور رکھتی ہو۔ بعض حکمائے نے حقیقت کی تلاش میں یہی طریق اختیار کیا۔ کہ پہلے ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھا اور پھر اُن میں سے جن جن چیزوں کی حقیقت کا استدلال ہو سکا۔ انھیں تسلیم کرتے چلے گئے۔ اس طرح سب سے اولین چیز جو حقیقت کے طور پر تسلیم کی جاتی رہی وہ سوچنے والے کا اپنا وجود ہے کیونکہ شک کرنے کے لیے ایک شک کرنے والی ذات کا وجود ضروری ہے۔ اگر وہ ذات ہی موجود نہ ہو تو شک کون کرے۔ ہر چیز کا انکار یہی حقیقت میں انکار کرنے والے کی ذات کا اقرار ہے۔ ڈیکارٹ نے اپنے فلسفہ کی بنا اسی پر رکھی تھی۔

۔ خطبات صفحہ ۷۳

کہ میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں"[۵۱] انسان کی اپنی ذات۔ انا یا خودی ایک ایسی چیز ہے جو اس دنیا کی حقیقت میں سب سے پہلے تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ یہی ایک چیز ہے جو ابتدا ہیں تمام کائنات میں میرے لیے زیادہ یقینی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد ہی ہم باقی حقائق کی طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم نہ کریں تو اپنے فلسفیانہ استدلال میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ اس لحاظ سے بچہ کی حقیقت اُس لمحہ سے ہی نمایاں ہوتی ہے۔ جب اس میں احساسِ خودی پیدا ہوتا ہے ؎

این "من" نو زادہ آغازِ حیات
نغمۂ بیداریٔ سازِ حیات   رموز ۱۰

اس کے بعد یہ احساس اُس میں ہمیشہ قائم رہتا ہے ؎

من از بود و نبودِ خود خموشم   اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
ولیکن این نوائے سادہ کیست   کسے در سینہ می گوید کہ ہستم
پیامِ مشرق ۳۸

اسی استدلال کے ماتحت کہا ہے ؎

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں   باقی ہے نمود سیمیائی
بالِ جبریل ۹

انسان کو اس کی شخصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بلند درجہ عطا کیا ہے۔ اقبال کے نظریہ کے مطابق تمام ہستی الیذ سے عبارت ہے

---

۵۱ I Think, therefore I am (cogito, ergo sum)

اور خدائی قوت کا ہر جوہر فرد الگ ایغو ہے لیکن اس کی ایغو کے مختلف درجے[1] ہیں۔ انسانی ذات میں اُسے بہت بلندی حاصل ہوتی ہے اسی لیے قرآن کریم میں انائے مطلق کو انسان سے اُس کی رگِ گردن سے زیادہ قریب بتایا گیا ہے[2]۔

[1] خطبات میں بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ "اسلامی مفکرین میں ہمیں شہاب الدین سہروردی کی تصانیف میں حقیقت کے مدارج کا تصور ملتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں یہ خیال زیادہ بڑے پیمانہ پر ہیگل میں موجود ہے"۔ صفحہ ۲۷

شیخ شہاب الدین شیخ الاشراق مقتول کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے ہستی کے مختلف عوالم اور روحانی ترقی کے مدارج بیان کیے ہیں۔ فلسفۂ عجم میں علامہ مرحوم نے ان کا حال لکھا ہے کہ "وہ بارھویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوئے انھوں نے ماجد جیلی سے فلسفہ سیکھا اور ابھی نوجوان ہی تھے کہ اسلامی دنیا میں زبردست مفکر کی حیثیت سے تسلیم کیے گئے۔ سلطان صلاح الدین کے بیٹے الملک الظاہر نے جو ان کا زبردست مداح تھا۔ ان کو حلب میں مدعو کیا۔ یہاں اس نوجوان فلسفی نے اپنی آزادانہ دانشگاہ کو اس طرح پیش کیا کہ اس زمانے کے متکلمین میں اُس سے زبردست رشک پیدا ہوگیا۔ چنانچہ انھوں نے سلطان صلاح الدین کو لکھا کہ شیخ کی تعلیم اسلام کے لیے ایک خطرہ ہے اور مذہبی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ اس فتنہ کو شروع ہی میں مٹا دیا جائے۔ سلطان اس پر راضی ہو گئے۔ ۳۶ سال کی عمر میں اس نوجوان ایرانی مفکر نے اُس مہلک ضرب کے آگے سر جھکا دیا۔ جس نے اس کو شہیدِ حق بنا کر اس کے نام کو بقائے دوام عطا کیا۔ قاتلین تو مر چکے ہیں لیکن وہ فلسفہ جس کی قیمت خون سے ادا کی گئی تھی۔ ابھی تک زندہ ہے اور مخلص متلاشیانِ صداقت کو اپنی طرف کھینچتا ہے"۔ صفحہ ۱۶۶

[2] خطبات صفحہ ۲۷

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۵۰/۱۶﴾	ہم اُس کی رگِ جان سے بھی نزدیک ہیں۔

لیکن انسان کا اپنے آپ کو مکمل طور پر سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ جتنا پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان نے ہمیشہ اپنی استطاعت کے مطابق اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مختلف مذاہب، مختلف اوقات کے فلسفہ اور علم اور ہر زمانہ کے صوفیا نے اس طرف توجہ دی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ علامہ اقبال نے اس اہم مسئلہ کے متعلق اسرار خودی کے دیباچہ میں یوں تحریر فرمایا ہے "یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں یہ پر اسرار شئے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے یہ خودی یا انا، یا 'میں'، جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے۔ جو تمام مشاہدات کی خالق ہے جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی۔ کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنے فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریبِ تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی ہوگی۔ جس کے حکما و علما نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال

کا جواب پیدا کرنے کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو"۔

ان سوالوں کے جواب میں علامہ اقبال ہمیں بتاتے ہیں کہ خودی ایک لازوال حقیقت ہے۔ جو اپنی نمود خود کرتی ہے ؎

وانمودن خویش را خوے خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروئے خودی است (اسرار ۱۴)

اور پیکرِ ہستی اسی خودی کا نتیجہ ہے ؎

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہرچہ می بینی ز اسرارِ خودی است (اسرار ۱۲)

علامہ اقبال ڈاکٹر میکٹگرٹ سے متفق ہیں کہ دنیا افراد کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ لیکن یہ وابستگی مقرر اور معیّن نہیں اور اس مجموعہ میں جو نظم و نسق اور تطابق ملتا ہے وہ بھی کامل اور حتمی نہیں۔ یہ ایک تخلیقی عمل ہے جو ہر وقت جاری ہے اور افراد کی جبلی کوششوں سے ہمارا قدم انتشار و بدنظمی سے نظم و ترتیب کی طرف اٹھ رہا ہے تکمیلِ نظام کے عالی شان مقصد میں افراد اپنا حصہ شامل کرتے جاتے ہیں اور اس طرح انسان دائمی فعلیت کی صورت میں رہتا ہے ؎

افراد کی تعداد بھی معیّن نہیں۔ افراد بدلتے رہتے ہیں۔ اور روزمرہ اس تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح نو زائیدہ افراد کائنات عظیم میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں

ہیں کائنات کوئی فعل مختتم نہیں۔ بلکہ تکمیل کے منازل طے کر رہی ہے۔

فرد کا منتہائے نظر یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے بلکہ اس کے برعکس اس کا مقصود اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھنا ہے۔ لیکن تکمیل خودی سے مراد غرور یا خود بینی نہیں بلکہ علامہ مرحوم کے الفاظ میں "اس کا مقصود محض احساس نفسی یا تعین ذات ہے"

اس تعین ذات اور اپنے جوہر کی نمود پر انسان کی مادی و روحانی ترقی اور تسخیر چار سو کا دار و مدار ہے اور اسی کے اثبات سے وہ خدائی کے اثبات تک پہنچتا ہے اور اس علم کے ذریعہ پھر وہ خدا کو پہچانتا ہے۔ اس نکتہ کو علامہ اقبال نے نہایت خوبی سے بیان کیا ہے

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے؟ فقط جوہر خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

ضرب کلیم ۲۸

رسول اکرمؐ نے اسی اہمیت کے پیش نظر فرمایا:۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ	جس نے اپنے آپ کو پا لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

انسان اگر اپنی نظر سے پنہاں نہ ہو تو اللہ تعالےٰ کو بھی

لیتا ہے۔ ؎

تو ہے میرے کمالاتِ ہنر سے | نہ ہو نومید اپنے نقش گر سے
مرے دیدار کی ہے اک یہی شرط | کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے

ارمغان حجاز ۲۲۳

اقبال نے 'منکراو' کو بھی 'منکر خویشتن' ہونے سے روکا ہے کیونکہ انسان جب اپنا اقرار کر لیتا ہے۔ تو لازمی طور پہ باقی حقائق کو بھی پالیتا ہے ؎

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خس چمن مشو
منکرِ او اگر شدی منکرِ خویشتن مشو

زبورِ عجم ۸۷

ایک اور جگہ لکھا ہے ؎

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

وہ انسان جو اپنے آپ کو نہ پا سکے حقیقت کبریٰ کو کیا پا سکے گا ؎

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است | منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

جاوید نامہ ۲۳۹

غلام ہمتِ آں خود پرستم | کہ با نورِ خودی بیند خدا را

پیام مشرق ۵۷

زندگی ہمہ ''میں'' یا ''انا'' کا احساس جتنا زیادہ ہوتا ہے۔ حقیقت

اُتنی ہی نمایاں ہو کر نظروں کے سامنے آتی ہے۔ اس احساس مضبوط کرنے کے لیے جد و جہد و عمل و سعی کی ضرورت ہوتی ہے ویسے تو اس کے پہلے احساس کے لمحہ سے ہی ایسی حرکت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جو خودی کو مضبوط کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ لیکن تکمیل خودی کے لیے جس عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ خاص جد و جہد اور سعی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جہد و عمل کے بغیر خودی کی تکمیل نہیں ہوتی عمل اور جد و جہد کا یہ سلسلہ افلاطون کے غیر متحرک نظام سے جو اس نے اپنے فلسفہ میں پیش کیا۔ بالکل مختلف ہے۔

افلاطون نے جب واقعات و اسباب کی دنیا کا مطالعہ کیا اور اس کی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی تو اس دنیا کے متناقض واقعات خیر و شر، ذہن و فطرت اور مادہ و روح وغیرہ کے حل میں اُلجھ کر رہ گیا ہے

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور ‏ ‏ ‏ ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف

بالِ جبریل ۱۱۲

جب وہ ان کے متعلق اور کوئی جواز نہ پا سکا تو اُس نے خارجی دنیا کے ان تمام حقائق کو سراب قرار دیا اور کہا کہ یہ سب کچھ بے حقیقت ہے۔ اصلی دنیا اس سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ اُس دُنیا کو اُس نے اعیان نامشہود[1] کے نام سے پکارا اور قرار دیا کہ ہم اشیاء کی اصل حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ صرف سائے دیکھتے ہیں۔ روشنی کی طرف ہماری

[1] Ideas

بیٹھا ہے اور اندھیرے کی طرف رُخ - اس کو اس نے تمثیل کے رنگ میں یوں بیان کیا کہ" نوع انسانی ایک ایسی غار میں سکونت پذیر ہے جس کا منہ روشنی کی طرف کھلتا ہے۔ اُس کے اندر مکمل اندھیرا ہے - انسان شروع زمانہ سے ہی اس غار کے منہ پر زنجیروں میں اس طرح جکڑا ہوا بیٹھا ہے - کہ وہ پیچھے کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھ سکتا۔ اُن کے پیچھے آگ کے بڑے بڑے شعلے ہیں۔ جن سے غار کے آخری حصے پر روشنی پڑتی ہے - ان شعلوں کے سامنے سے لوگ ایک طرف سے دوسری طرف گزرتے رہتے ہیں۔ جن کے پاس قسم قسم کے برتن، سامان اور چیزیں ہوتی ہیں۔ ان گزرنے والے لوگوں اور سامان کا سایہ غار کے اندر سامنے والی دیوار پر پڑتا ہے۔ غار کے منہ پر بیٹھے ہوئے انسان ان تمام چیزوں کا سایہ تو سامنے کی دیوار پر دیکھتے ہیں۔ لیکن پیچھے مُڑ کر ان کی اصلیت یا حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے وہ اُسی سائے کو حقیقت سمجھتے ہیں۔ جو اُن کے سامنے دیوار پر اِدھر سے اُدھر گزرتا دکھائی دیتا ہے "

افلاطون کے عدم، کے یہ تصورات ازلی۔ غیر زمانی اور غیر مکانی ہیں اُس کے خیال کے مطابق حقیقی دنیا جو ہمارے حسی تجربہ سے دُور کہیں ماوراء ہے۔ اس دھوکہ کی زندگی سے (جو ہمیں حسّی تجربہ سے حاصل ہوتی ہے) بالکل علیحدہ ہے۔ حقیقی دنیا ہم آہنگ ہے۔ اُس کی حیثیت منزہ اور معین ہے۔ انسانی کوشش اُس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ افلاطون تخمیت کے وجود کا منکر ہے۔ اسی لیے

اُس کے فلسفہ نے ایک ایسی غیر متحرک زندگی کو پیش کیا جس میں جد و جہد کی کوئی گنجائش نہیں۔ مغربی فلسفہ میں اس سکون و جمود کی تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ زندگی افسردہ ہو گئی اور شوپن ہور (۱۷۸۸ء - ۱۸۶۰ء) نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ فانی انسان کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ اس زندگی سے روشناس ہی نہ ہو۔ تاکہ سورج کی تیز کرنیں اُس کی نظر کو خیرہ نہ کریں اور جو شخص پیدا ہو۔ اُس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ جس قدر تیزی سے ممکن ہو۔ موت کے دروازہ سے گزر کر زیادہ سے زیادہ مٹی کے بوجھ کے نیچے دفن ہو جائے۔

اقبال، ہنگامۂ موجود، کے منکر افلاطون کی اس گوسفندی تعلیم کا مخالف ہے ؎

راہب دیرینہ افلاطوں حکیم	از گروہ گوسفندانِ قدیم
رخش او در ظلمتِ معقول گم[1]	در کہستانِ وجود افگندہ سم
آنچناں افسونِ نامحسوس خورد	اعتبار از دست و چشم و گوش برد
گفت سرِ زندگی در مردن است	شمع را صد جلوہ از افسردن است
فکرِ افلاطون زیاں را سود گفت	حکمتِ او بود را نابود گفت
فطرتش خوابید و خوابے آفرید	چشمِ ہوشِ او سرابے آفرید
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود	جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت	خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

اسرار ۳۴

[1] ظلمتِ معقول - فلسفے کی تاریکی۔

اسلام اس نظریہ کا مخالف ہے۔ کیونکہ اسلام میں زندگی اور کائنات حقیقی چیزیں ہیں۔ مادہ اور روح دونوں ایسے حقائق ہیں۔ جن سے انکار نہیں ہو سکتا۔ افلاطون کے عالم اعیان، کے مقابلہ میں یہاں عالم امکان ہے ؎

زندہ جان را عالم امکان خوش است　　مردہ دل را عالم اعیان خوش است

اسرار ۲۵

اقبال کا عالم امکان خیالی نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے انسانی زندگی خارجی اثرات اور انسان کے اپنے ارادہ و عمل کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔ زندگی صدف کی مانند ہے اور خودی اس میں قطرۂ نیساں ؎

زندگانی ہے صدف قطرہ نیساں ہے خودی

وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی

یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

ضرب کلیم ۲۵

زندگی تلوار ہے تو خودی مثل تلوار کی دھار ہے۔ زندگی کی نمود خودی سے ہے اور خودی کی قوت کے سامنے سنگ گراں کی کوئی وقعت نہیں۔ لیکن اس کی تقویم کا راز حرکت و فعلیت میں ہے ؎

روح نفس کیا ہے تلوار ہے　　خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات　　خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند | سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک | من و تو میں پیدا من و تو سے پاک
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی | ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی | دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں | پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر | ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے — بالِ جبریل ۱۶۲

مسلمان کی زندگی کی بنیاد تین چیزوں کے اثبات پر ہے:-

۱۔ کائنات

۲۔ خودی

۳۔ خدا

ان تینوں کے شعور سے ہم اپنی تکمیل کرتے ہیں - خودی سے ہم خدا کی خدائی یعنی کائنات کے علم تک پہنچتے ہیں اور اس علم سے ہی خدا کو پہچانتے ہیں - اس حقیقت کو قرآن کریم نے صرف چند لفظوں میں یوں سمیٹ کر بیان کر دیا ہے:-

وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۙ وَ فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا	یقین لانے والوں کے لیے زمین میں (خدا کی قدرت کی) بہت نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں میں بھی

تبصِرُوْنَ ۔ $\frac{۵۱}{۲۱-۲۰}$ | کیا تم نہیں دیکھتے ۔

کائنات اپنا وجود خود انسان کو محسوس کراتی ہے ۔ جب اُس کا مقابلہ کرنے اور تسخیر کرنے کے لیے انسان کو اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے ۔ اس طرح ایک ہی وقت میں اُسے کائنات کا علم بھی ہوتا ہے اور خود اپنی ذات کی بے پناہ قوتوں سے بھی واقف ہو جاتا ہے ۔ یہ مقابلہ اور رکاوٹ انسانی خود آگاہی و خودشناسی میں اہم عنصر ہے ۔

کائنات و خودی کی نشانیوں سے انسان آگے بڑھ کر اثباتِ ذاتِ خداوندی تک پہنچتا ہے ۔ انسان خودی رکھتا ہے اور حق تعالےٰ بھی ایغو سے عبارت ہے ۔ اس لحاظ سے ان دونوں میں ربط ہے ؎

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب

ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب زبورِ عجم ۱۶۲

اگر انسان اپنے آپ سے نامحرم نہ ہو تو حقیقتِ کبریٰ کو بھی نہایت آسانی سے پالیتا ہے ؎

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور کہ جانِ تو ز خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

پیامِ مشرق ۲۴

حق تعالےٰ کی دو شانیں ہیں ۔ ایک یہ کہ وہ اضافات سے ماورا و کافی بالذات ہے اور دوسری یہ کہ کائناتِ مدرکہ کے خارجی مظاہر کے طور پر بھی ظاہر ہوتا ہے ۔ اس طرح وہ انسان اور کائنات سے

وابستہ بھی ہے اور ماورا بھی ۔

اس بحث سے یہ ظاہر ہو گیا کہ انسانی خودی ہی وہ اہم عنصر ہے جو انسان کے کائنات اور حق تعالےٰ میں تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہے ۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ "قرآن کریم کا بڑا مقصد انسان میں اس کے ان تعلقات کے علم کی بیداری پیدا کرنا ہے ۔ جو انسان کے خدا اور کائنات سے ہیں ۔ قرآنی تعلیم کے اس اہم پہلو کی وجہ سے گوئٹے نے اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ایسی تعلیم کبھی ناکام نہیں ہوتی اور کوئی نظام اور کوئی انسان اس سے زیادہ آگے جا بھی نہیں سکتا" [1]

علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں اسے یوں بیان فرمایا ہے ؎

گفتمش موجود و ناموجود چیست؟ — معنیٔ محمود و نا محمود چیست؟

گفت "موجود آنکہ می خواہد نمود — آشکارائی تقاضائے وجود

زندۂ یا مردۂ یا جاں بلب — از سہ شاہد کن شہادت را طلب

شاہدِ اول شعورِ خویشتن — خویش را دیدن بنورِ خویشتن

شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے — خویش را دیدن بنورِ دیگرے

شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق — خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق

جاوید نامہ ۱۳

زندگی اور حق کا یہ شعور آخرکار انسان کو اس درجہ پر پہنچا دیتا ہے ۔ جس سے ہستی کو دوام حاصل ہوتا ہے اور جو انسان کو حق تعالےٰ

[1] خطبات صفحہ ۹۳

کا شاہکار پکارے جانے کے قابل بناتا ہے۔ اگر انسان خود بیں۔ جہاں بین اور خدا بین نہ بن سکے تو اشرف المخلوقات اور سلطان بحر و بر کہلانے کا مستحق نہیں رہتا ؎

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا؟ کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا!
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا

بال جبریل ۴۲

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان جو کمزوریوں سے مبرا نہیں کس طریق سے ایسی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ جو اُسے سرفراز و سربلند کرے۔ اس مسئلہ پر اگر ہم ذرا گہری نظر سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان کے لیے غلطیوں کا ممکنات سے ہونا ہی اُسے باقی کائنات سے ممیز کرتا ہے اور اُسے آزاد شخصیت کی نعمت سے روشناس کراتا ہے۔ اس شخصیت سے اُسے وہ آزادی عطا ہوتی ہے۔ جیسے وہ گناہ کے ارتکاب کے وقت بھی اُسی طرح استعمال کرتا ہے۔ جس طرح نیک کام کے انتخاب میں کرتا ہے۔ وہ غلطی کا ارتکاب کرتا ہے۔ لیکن اس کے بغیر اُسے خودی کا صحیح و مکمل احساس نہیں ہوتا۔ جاوید نامہ میں سلطان شہید کی زبانی فرماتے ہیں ؎

چوں بروید آدم از مشتِ گلے با دلے، با آرزوے در دلے
لذتِ عصیاں چشیدن کارِ اوست غیرِ خود چیزے ندیدن کارِ اوست
زانکہ بے عصیاں خودی ناید بدست تا خودی ناید بدست آید شکست!

جاوید نامہ ۲۱۳

علامہ اقبال کے خیال میں انسانی شخصیت کو روزمرہ زندگی کے شعبہ کے طور پر تسلیم کرنے کے ساتھ ہی ہم مجبور ہیں کہ ہم انسان کی ممکن کمزوریوں کا بھی اقرار کریں۔ خطبات میں انسانی شخصیت کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے علامہ مرحوم لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے مطالعہ سے تین امور بالکل واضح ہو جاتے ہیں:۔

(۱) کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر باقی کائنات میں سے انتخاب فرمایا اور نوازا۔

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى ○ ۲۰/۱۲۲	اُن کے پروردگار نے اُن کو نوازا اور پھر اُن کے اُوپر آیا اور راہ دکھائی

(۲) کہ انسان کو اُس کی خامیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے زمین پر خلافت کا درجہ عطا کیا۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ	تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا۔ کہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں۔ تو فرشتوں نے کہا کیا تو زمین میں ایسے شخص کو نائب بناتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے اور خون ریزیاں کرے۔ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

نے فرمایا ۔ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۔

۲/۳۰

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۶/۱۶۶

وہی قادر مطلق ہے ۔ جس نے تم کو زمین کا جانشین کیا اور بعض کو بعض پر درجوں میں فوقیت دی ۔ تاکہ جو نعمتیں تم کو دی ہیں ۔ اُن میں تمھاری آزمائش کرے ۔

(۳) یہ کہ انسان ہی آزاد شخصیت کی امانت سے نوازا گیا ۔ جو امانت اُس نے اپنی ذمہ داری پر قبول کرلی اور جس کی متحمل کائنات کی کوئی دوسری چیز نہ ہوسکتی تھی ۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۳۳/۷۲

ہم نے امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے پیش کیا ۔ سب نے اُس کے اُٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے ۔ انسان نے اس کو اُٹھا لیا ۔ تحقیق وہ ظلوم اور جہول تھا ۔

انسانی شخصیت کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے یہ تین امور کافی ہیں ۔ لیکن اگر اس کی مزید تفصیل درکار ہو ۔ تو قرآن کریم کے ابتدائی پارہ میں وہ اسلوب بیان موجود ہے ۔ جو آدمؑ کی خلافت کے متعلق ہے ۔

وہ ذکر محض داستان نہیں۔ بلکہ انسان کی اصلی حیثیت اور اُس کے بلند مقام کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں " انسان کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا۔ اس کو تمام اسماء کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیاء کو اُس کے تصرف میں دینا تھا۔ وہ اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ط کے فرمان کی رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اُس کا سر خلافتِ الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے۔ کروڑوں مخلوقاتِ الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی منتخب ہُوا نہ زمین کے حصہ میں آیا نہ پہاڑ اُس کے مستحق قرار پائے۔ صرف انسان ہی کا سینہ تھا جو اس امانت کا خزینہ قرار ہوا اور اُسی کی گردن تھی جو اس بوجھ کے قابل نظر آئی۔ وحی محمدی نے انسان کا رتبہ یہ بتایا کہ اللہ تعالےٰ نے اُس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا۔ عالمِ مخلوقات میں برتر بنایا اور انعام و اکرام سے معزز کیا ہے "[1]

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ع ۱۷/۲	ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور خشکی اور تری میں ان کو سوار کیا اور انھیں کھانے کو عمدہ چیزیں دیں اور جتنی مخلوقات ہم نے پیدا کی ہے اُن میں بہتیروں کے اوپر ہم نے انھیں بزرگی دی۔

[1] سیرۃ النبی جلد چہارم صفحہ ۴۸۲

حق تعالےٰ کو یہ علم تھا کہ انسان کو شخصیت کی نعمت سے مالامال کرنے سے اُس کے سامنے اختیار و انتخاب کی راہیں کھل جائیں گی۔ اور قدرتی طور پر یہ قابلیت اُس میں ودیعت ہو گی کہ اپنے سامنے کے مختلف رستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلے جہاں نیکی کے انتخاب کا اُسے اختیار ہوگا وہاں بدی بھی اختیار کی جاسکتی ہے لیکن اللہ تعالےٰ نے انسان پر اعتماد کیا اور وہ مقدس امانت جس کا ذکر اوپر ہوا اُس کے سپرد کر کے کائنات میں افضل کر دیا۔ ذاتی اختیار و ارادہ کا یہ جوہر انسان کو ملائکہ سے اس لحاظ سے افضل بنا دیتا ہے کہ وہ اِس سے محروم ہیں۔ وہ صرف اطاعت و فرمانبرداری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اُن میں عصیان و تمرد یا حکم الٰہی سے منہ موڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اُن میں ایسی کوئی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ وہ تو صرف اُس حکم کی تعمیل کر دیتے ہیں۔ جو اُنہیں دیا جاتا ہے۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ٥ ۶۶/۶	جو انھیں حکم دیا جاتا ہے۔ اُس میں اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اور اُس کی تعمیل (بلاکم و کاست) کرتے ہیں۔

نیک و بد کی پہچان اور اختیار و ارادہ کے مسئلہ پر عیسائیت اور اسلام میں بنیادی اختلاف ہے۔ انجیل کے مطابق خدا نے آدمؑ کو باغ عدن میں رکھا اور حکم دیا کہ تم باغ کے درخت سے پھل کھایا کرو لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کے نزدیک نہ جانا۔ اس کے برخلاف اسلام اسی نیک و بد کی

پہچان کو وجہ شرفِ انسانیت بناتا ہے۔ علامہ اقبال اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہبوطِ آدم کا قرآنی بیان کرہ ارض پر انسان کی پہلی آبادی کو ظاہر کرنے کے لیے نہیں۔ جتنا اس کے اس ارتقا کو ظاہر کرنے کے لیے ہے جو اس کی ابتدائی جبلی خواہش سے ایک آزاد شخصیت کے ودلیعت ہونے پر اسے حاصل ہوا اور وہ شک کرنے اور نافرمانی کے قابل بنا قرآن کریم کا بیان اس بارہ میں بھی انجیل سے مختلف ہے کہ انجیل آدم کی نافرمانی کے لیے زمین کو کوستی ہے۔ لیکن قرآن کریم میں زمین کو انسان کی بجائے رہائش اور فائدے کا ذریعہ بیان کیا ہے جس کے لیے اسے اللہ تعالےٰ کا شکر گزار ہونا چاہیئے :۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ۗ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ؏ ۷/۱	ہم نے تم کو زمین میں رہنے اور تصرف کرنے کے لیے جگہ دی اور اسی میں تمہارے لیے زندگی کے سامان مہیا کیئے تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔

آدم کے جنت سے اخراج کا مطلب اخلاقی تنزل نہیں اور نہ ہی قرآن کریم کے مطابق زمین اذیت و زحمت کا ایسا مقام ہے جہاں کوئی فطرۃً بد انسانیت اپنے گناہ کے لیے محبوس کر دی گئی ہو۔ انسان کی نافرمانی کا پہلا فعل اس کے اختیار کا بھی اولین مظہر تھا اور اسی لیے قرآنی بیان کے مطابق اسے معاف کر دیا گیا۔ آدمؑ نے شیطان کے کہنے میں آکر اپنی پستیِ فطرت کی وجہ سے نہیں بلکہ

عجول[1] ہونے کے سبب سے حقیقت کو پانے کا چھوٹا رستہ اختیار کیا۔ اس رویہ کی درستی کا واحد طریق یہ تھا۔ کہ اُسے ایسے ماحول میں رکھا جائے۔ جو خواہ کتنا ہی تکلیف دہ ہو۔ لیکن اُس کی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے مناسب ہو۔ اس ماحول میں آدم کو بھیجنے کا مدعا سزا دینے کا نہ تھا۔ بلکہ شیطان کے اُس ارادہ کو ناکام بنانا تھا جو اُس نے آدم سے عداوت کی بنا پر اپنی حکمت عملی کے ذریعہ بنی نوع انسان کو اُس کی دائمی ترقی و توسیع ذات کی مسرتوں سے محروم رکھنے کے لیے اختیار کیا[2]

اگر انسان اپنی شخصیت کی اس نعمت کو کما حقہ سمجھے۔ تو وہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہے ؎

اے ز آداب امانت بے خبر	از دو عالم خویش را بہتر شمر

اسرار ۵۷

چراغے درمیانِ سینۂ تُست	چہ نوراست این کہ در آئینۂ تست!
مشو غافل کہ تو او را امینی	چہ نادانی کہ سوئے خود نہ بینی

زبورِ عجم ۲۲۶

اللہ تعالےٰ نے انسان کو سمیع و بصیر بنایا اور شعور و ادراک اور ارادہ واختیار عطا کیا۔ فطرت صحیحہ پر گامزن ہونے کے لیے وحی خداوندی

---

[1] وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا ۱۱/۱۷ انسان بہت جلد باز ہے۔

[2] خطبات صفحہ ۸۵ تا ۸۷

کے ذریعہ ہدایت کا راستہ بھی دکھا دیا۔ اب اُسے قبول کرنا یا اُس انکار کرنا اُس کا اپنا کام ہے:۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَٰهُ سَمِيعًا بَصِيرًا إِنَّا هَدَيْنَٰهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَّإِمَّا كَفُورًا

۷۶
۲-۳

ہم نے انسان کو مرکب نطفے سے پیدا کیا (غرض یہ تھی کہ) اُس کو آزما... پھر اسی لیے ہم نے اس کو سننے وا... دیکھنے والا بنایا پھر ہم نے اس کو ر... بھی دکھایا (اب دو قسم کے انسان ہیں) شکر گزار یا کفر کرنے والے۔

انسانی سرشت میں اختیار و ارادہ کی اہمیت اِس درجہ کی ہے کہ ہا... ربانی بھیجنے میں بھی اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا طریق اختیار نہیں کیا۔ ... سے انسان کے اختیار و ارادہ کی آزمائش نہ ہو سکے۔ اللہ تعالےٰ اس بات پر قادر تھا کہ لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے سامنے آسمان نورانی فرشتے اتارتا اور وہ وحی کے الفاظ سنا دیتے۔ لیکن چونکہ اس خدشہ تھا کہ انسان خوف و ہراس کی وجہ سے ہدایت قبول نہ کرے ... لیے انسانوں میں سے ہی رسول بنا کر بھیجے تاکہ تمام انسان اپنی انسا... کے بہت بڑے جوہر کو جو اُن کا خاص امتیاز ہے پوری آزادی سے استعمال کر سکیں۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا یہ ایسی خصوصیت ہے صرف انسان کو ہی حاصل ہے۔ اور جس سے فرشتے اور کائنات کی شئے محروم ہے۔ اُن کے لیے اپنے خاص اسلوب پر چلنے کے علاوہ

دوسرا راستہ نہیں ہے۔ انھیں جو حکم دیا گیا ہے۔ وہ اسی کی تعمیل میں لگے ہوئے ہیں اور اس سے سرکشی وانحراف اختیار نہیں کر سکتے۔ ان کی مجبورانہ اطاعت (جسے ہم ان کی فطرت یا جبلت کا نام بھی دے سکتے ہیں) کا ذکر قرآن کریم میں یوں ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ $\frac{16}{49-50}$	اور جتنی چیزیں آسمانوں میں اور جتنے جاندار زمین میں ہیں سب اللہ ہی کے آگے سربسجود ہیں اور نیز فرشتے اور وہ (حکم خدا سے) سرتابی نہیں کرتے اور اپنے پروردگار سے جو ان کے اوپر موجود ہے ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں۔ اور جو حکم ان کو دیا جاتا ہے اسی کی تعمیل کرتے ہیں۔

لیکن انسان کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم نے یہ قاعدہ کلیہ اختیار نہیں کیا کائنات کی دیگر اشیاء و انسان کا مقابلہ یوں کیا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ	کیا تو نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، جانور سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں اور کتنے ہی انسان بھی لیکن بہت سے انسان ایسے بھی ہیں

وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ؕ سجدہ ۲۲/۱۸	کہ ان پر (روگردانی کی وجہ سے) عذاب کی بات ثابت ہو گئی ہے اور جسے اللہ (اس وجہ سے) ذلت میں ڈال دے تو پھر کوئی اُسے عزت دینے والا نہیں۔ بے شک اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

سارے کے سارے انسان دیگر کائنات کی کل اشیاء کی طرح اللہ کے قوانین کے آگے سربسجود نہیں۔ وہ انسان جو سننے والا اور دیکھنے والا ہوتے ہوئے بھی ہدایت کو قبول نہ کرے۔ اور اُس اعتماد میں پورا نہ اُترے جو اللہ تعالےٰ نے اس پر کیا اور جس کا بوجھ اُس نے اٹھایا تو اُس سے بڑھ کر ظالم اور جاہل کون ہوگا۔ حقیقت میں انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا گیا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ٥ ۹۵/۴	ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت میں پیدا کیا۔

لیکن پھر اُسے ایک ایسے امتحان میں ڈالا گیا۔ جس میں اُسے اپنی شخصیت کی ترقی کے پورے مواقع میسر آسکتے ہیں :-

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ ۲۱/۳۵	ہم تمہیں برائی اور بھلائی کی آزمائش کے ساتھ آزماتے ہیں۔

جب وہ اس امتحان میں پورا اترتا ہے تو ملائکہ سے بھی بلند درجہ کا مستحق ہوتا ہے ؎

مقام بندگی دیگر، مقام عاشقی دیگر ز نوری سجدہ میخواہی زخاکی بیش ازاں خواہی!

زبور عجم ۶۱

لیکن جب انسان بدی کی رو میں بہہ جاتا ہے تو بہائم کے درجہ سے بھی گر جاتا ہے:۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ ۹۵/۴ | اور پھر اُس کو کمتر سے کمتر درجہ میں لوٹا لائے۔

زمین پر انسانی خلافت کے سلسلہ میں ایک نکتہ اور قابلِ ذکر ہے۔ جس کی طرف علامہ مرحوم نے توجہ دلائی ہے۔ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں انسان کو جہاں محض ایک زندہ فرد کے طور پر بیان کرنا مقصود تھا۔ وہاں لفظ "بشر" یا "انسان" استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن اُن آیات میں جہاں اس کا ذکر بطور خلیفہ یا خدا کے نائب کے آیا ہے۔ اُس کے لیے لفظ "آدم" استعمال ہوا ہے[1] اور یہی وہ عظمت ہے جس کی وجہ سے کتنی ہی آنکھیں اُس پر لگی ہوئی ہیں ؂

تو کیستی زکجائی کہ آسمان کبود ہزار دیدہ براہ تو از ستارہ کشود

انسان کی اس عظمت کی وجہ سے اُسے نظام کائنات میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے علامہ اقبال کے نزدیک انسانی ہستی اور شخصیت اس درجہ اہم ہے کہ خدا کی ہستی میں بھی انسان کو اپنی ہستی یا خودی فنا نہیں کرنی چاہیئے۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کے جواز میں چند امور پیش

---

[1] خطبات صفحہ ۸۳

کیے جائیں :-

(۱) اگر انسانی ہستی کا قیام ضروری نہ ہوتا تو رسولِ اکرمؐ تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللهِ - (اپنے اندر صفاتِ الٰہیہ پیدا کرو) کی تعلیم نہ دیتے بلکہ ذاتِ واجب میں جذب ہو جانے کی ہدایت فرماتے - علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ اگر انسان خدا کو اپنے اندر جذب کرلے تو ہم اُسے فنا نہیں کہہ سکتے - البتہ انسان کے لیے یہ واجب نہیں کہ وہ خود خدا کی ذات میں فنا ہو جائے - اُس کا فرض یہ ہے کہ صفاتِ الٰہیہ کو حدِ بشری تک پیدا کرنے کی جو استعداد اُس میں ودیعت کی گئی ہے - اُن کو اپنی ذات میں پیدا کرنے کی جد و جہد جاری رکھے اور اسی طرح ذاتِ واجب سے قریب

لہ اللہ تعالیٰ کے جن اوصاف سے انسان مشرف ہو سکتا ہے - اس کے متعلق علامہ سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی جلد چہارم صفحہ ۵۱۹ پر یوں تحریر فرمایا ہے -

"خدا کے صفاتِ کمالی میں سے وحدانیت اور بقائے ازلی و ابدی کے سوا کہ اُن سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں - بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے - صفاتِ تنزیہی سے بھی مخلوقات تمام تر محروم ہے - اُن کی تنزیہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیاں نافرمانی اور گنہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں -

خدا کے صفاتِ جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں - جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحبِ توفیق کے لیے حسبِ استعداد کھلا ہوا ہے "

مفصل بحث کے لیے سیرۃ النبی جلد چہارم صفحہ ۵۰۴ تا ۵۲۳

تر ہوتا جائے ؎

خودی اندر خودی گنجد محال است

خودی را عین خود بودن کمال است زبور عجم ۲۲۲

یہ وصال آغوش بحر میں موتی کے وصال کی مانند ہے جو اپنی ذات کو قائم رکھتا ہے ؎

وصال ما وصال اندر فراق است کشود این گرہ غیر از نظر نیست
گہر گم گشتۂ آغوش دریا است ولیکن آب بحر آب گہر نیست

ارمغان حجاز ۱۸۴

شبنم کے قطرہ کو اگر بحر میں ملنے کا موقع میسر ہو۔ تو اس کے لیے انکار واجب ہے ؎

من عیش ہم آغوشی دریا نہ خریدم
آں بادہ کہ از خویش ربا بابہ نچشیدم
از خود نہ رمیدم
ز آفاق بریدم
بر لالہ چکیدم پیام مشرق ۱۲۹

علامہ اقبال نے اسلامی الہیات کی جدید تشکیل کے چوتھے باب میں حلاج کے "انا الحق"[1] اور بایزید کی پکار پر بحث کی ہے۔ اُن کا خیال

[1] منصور حلاج کا نعرہ انا الحق صوفی لٹریچر میں بہت مشہور ہے۔ یہی اُس کے دار پہ لٹکائے جانے کا باعث ہوا۔ لیکن اُس کے زمانہ کے بعد کے تقریباً تمام (باقی اگلے صفحہ پہ)

یہ ہے کہ "انا الحق" کا یہ مطلب نہیں کہ میں خدا ہوں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ "انا" ہی اصلی اور حقیقی چیز ہے۔ جس کو ہر حالت میں قائم رکھنا ضروری ہے ایک فرانسیسی مستشرق[۵۲] نے حلاج کے جو حالات اکٹھے کر کے شائع کیے ہیں۔ اُن سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی کیفیت کی درست تعبیر قطرے کا سمندر میں جذب ہو جانا نہ تھا۔ بلکہ انسانی خودی کی بنیادی حقیقت کا اظہار کرنا اور اس کی بقا کو علیحدہ وجود سے قائم رکھنا تھا۔ اقبال کے خیال میں حلاج کا یہ فقرہ اس وقت کے ظاہر پرست متکلمین کو ایک چیلنج تھا جو روح کو مادہ کی لطیف صورت یا ایک حادثہ تصور کرتے تھے جس کی موت جسم کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اور جو پھر دوبارہ قیامت کے روز پیدا کی جاتی ہے۔ ان متکلمین نے انسان کی باطنی واردات پر توجہ نہ کی اور خودی کے درجہ کو نہ پہچانا۔

علامہ اقبال کے خیال میں نعرۂ "انا الحق" سے خودی کی تصدیق ہوتی ہے ؎

(بقیہ صفحہ ۲۱۷ نوٹ نمبر۱) بڑے بڑے صوفیا اس بات پر متفق ہیں کہ اس کا یہ اعلان کلمہ کفر نہیں بلکہ ایک گہری حقیقت کا اظہار تھا۔ مولانا روم نے اس کا اظہار اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے ؎

چون قلم در دست غدارے رسید — لاجرم منصور بر دارے رسید

محمود شبستری نے کہا ہے ع

انا الحق کشف اسرار است مطلق

۵۲ M. Massignon

وجود کوہسار و دشت و در ہیچ	جہاں فانی، خودی باقی، دگر ہیچ!
بخود گم بہرِ تحقیقِ خودی شو	انا الحق گوئے و صدّیق خودی شو

زبورِ عجم ۲۳۸

جاوید نامہ میں آپ نے اس امر کی پوری تشریح کی ہے۔ زندہ رود حلاج سے دریافت کرتا ہے

کم نگاہاں فتنہ ہا انگیختند	بندۂ حق را بدار آویختند را
آشکارا بر تو پنہانِ وجود!	باز گو آخر گناہِ تو چہ بود؟

جاوید نامہ ۱۴۲

حلاج جواب دیتا ہے کہ میرا گناہ صرف یہ تھا کہ میں نے ملت کو جو قصدِ گور کر چکی تھی۔ اپنے سینہ کی بانگِ صور (آوازۂ انا الحق) سے از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے

بود اندر سینۂ من بانگِ صور	ملتے دیدم کہ دارد قصدِ گور!
مومناں با خوئے و بوئے کافراں	لا الٰہ گویاں و از خود منکراں
وامر حقؔ، گفتند نقشِ باطل است	زانکہ او وابستۂ آب و گِل است
من بخود افروختم نارِ حیات	مردہ را گفتم ز اسرارِ حیات!
از خودی طرحِ جہانے ریختند	دلبری با قاہری آمیختند!
ہند و ہم ایران ز نوزش محرم است	آنکہ نارش ہم شناسد آں کم است!

لہ امرِ حق۔ روحِ انسانی تلمیح بآیہ قلِ الروح من امرِ ربی۔

من ز نور و نار او دادم خبر
بندۂ محرم! گناہِ من نگر! جاوید نامہ ۱۴۳

اسی لیے حلاج اقبال کو بھی خبردار کرتا ہے کہ تم بھی وہی کر رہے جو میں نے کیا ہے

آنچہ من کردم تو ہم کردی بترس!
محشرے بر مردہ آوردی بترس! جاوید نامہ ۱۴۴

علامہ اقبال ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ انسان میں صفاتِ الٰہیہ کے پیدا کرنے کی تعلیم (تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ) کا ہی یہ اظہار تھا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا میں بولتا ہوا قرآن ہوں، اور بایزید نے کہا۔ (سبحانی ما اعظم شانی)[1] اسی کے ماتحت اقبال نے سپنگلر کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ اسلام نفی خودی کی تعلیم دیتا ہے "حقیقت یہ ہے کہ یہ خودی کی نفی نہیں بلکہ قوتِ ایمان ہے جو ایک خاص کیفیت کا زندہ مظاہرہ اور ایسی زندگی بخش اور بے انتہا قوت ہے جو کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتی اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی ایک انسان کو سکونِ قلب سے نماز ادا کرنے کے قابل بنا دیتی ہے"[2]

یعنی آں فقرے کہ داند راہ را
بیند از نورِ خودی اللہ را

---

[1] خطبات صفحہ ۱۰۹ [2] خطبات صفحہ ۱۱۰

اندرونِ خویش جوید لَا اِلٰہ
در تہِ شمشیر گوید لَا اِلٰہ مسافر ۲۰

یہ کیفیت انسان کے اناد محدود کے .. انادِ مطلق میں مِل کر فنا ہو جانے کی نہیں ۔ بلکہ اپنے اندر ذاتِ واجب کو جذب کرنے کی ہے۔

مولانا روم بھی قطرے کا سمندر میں جذب ہو جانا پسند نہیں کرتے اگرچہ وہ اوصاف کو ذاتِ مطلق کے جذب میں شامل کرتے ہیں لیکن انسانی ذات کے علیحدہ قیام کو مختلف مثالوں سے واضح کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ دن کی روشنی میں شمع کی روشنی مدغم ہو جاتی ہے ۔لیکن سورج نکلنے سے شمع کا وجود ختم نہیں ہو جاتا۔ اُس کا وجود اُس وقت محسوس طور پر معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے شعلہ سے روئی کو جلا دیتا ہے ؎

ہست از روئے بقائے ذاتِ اُو نیست گشتہ وصفِ اُو در وصفِ ہو
چوں زبانۂ شمع پیشِ آفتاب نیست باشد ہست باشد در حساب
ہست باشد ذاتِ او تا تو اگر بر نہے پنبہ بسوزد زاں شرر
نیست باشد روشنی ندہد ترا کردہ باشد آفتاب او را فنا

رومی[1]

اقبال کی تعلیم یہ ہے کہ ذاتِ حق سے خلوت نصیب ہونے پر

---

[1] مثنوی دفتر سوم صفحہ ۳۱۶ (مطبع نامی کانپوری)

خودی اپنی جگہ قائم رہے اور بحرِ نور میں ناپید نہ ہو جائے۔ اس طرح انسان کے اندر زیادہ انفرادیت پیدا ہوتی ہے ؎

چناں باذاتِ حق خلوت گزینی ترا او بیند و او را تو بینی
بخود محکم گزر اندر حضورش مشو ناپید اندر بحرِ نورش
چناں در جلوہ گاہِ یار می سوز عیاں خود را نہاں او را برافروز

زبورِ عجم ۲۳۲

اقبال اُس جوئے تنک مایہ کو پسند کرتا ہے۔ جو ذوقِ خودی میں راستہ میں خشک ہو جائے۔ لیکن اپنے وجود کو دریا میں گم نہ ہونے دے ؎

اے خوش آں جوئے تنک مایہ کہ از ذوقِ خودی
در دلِ خاک فرو رفت و بدریا نرسید

زبورِ عجم ۱۲۹

(۲) اگر ذاتِ حق تعالےٰ میں فنا ہونا ہی انسان کا نصب العین ہوتا تو اللہ تعالےٰ انسان سے صرف اپنے قرب کو ہی بیان نہ فرماتے۔ بلکہ فنائیت کا بھی ذکر ہوتا ارشاد ربانی ہے:۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۔ $\frac{50}{16}$ ہم اُس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

(۳) آنحضرت صلعم کے معراج کے واقعہ سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ منتہائے نظر خودی کا فنا ہو جانا نہیں بلکہ صفات الہیہ کا حصول اور شانِ یکتائی کا پیدا کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ اقبال نے "اسلامی الہیات کی جدید تشکیل" میں ایک بڑے صوفی بزرگ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا ایک فقرہ نقل کیا ہے کہ "محمد عربی فلک الافلاک پر تشریف لے گئے اور واپس آ گئے۔ لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں اس مقام تک پہنچ جاتا۔ تو کبھی واپس نہ لوٹتا"۔ اقبال لکھتے ہیں کہ "تمام صوفی لٹریچر میں اس فقرہ سے بہتر الفاظ مشکل سے ملیں گے۔ جن کے ذریعہ ایک فقرہ کے اندر پیغمبرانہ و صوفیانہ شعور کے لطیف نفسیاتی فرق کو اس خوبی سے بیان کیا جا سکے۔ صوفی واقعی اپنے انفرادی تجربہ کی اس دنیا سے واپس نہیں آنا چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے۔ جیسا کہ اس کے لیے ضروری ہے تو اس کی مراجعت بنی نوع انسان کے لیے کوئی وقعت اور اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن نبی کی مراجعت تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ واپس آتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وقت کی رَو میں داخل ہو کر تاریخ کی محرک قوتوں پر قابو حاصل کرے اور اس کے ذریعہ مقاصد کا جہانِ تازہ پیدا کرے۔ صوفی کی انتہا وجدانی تجربہ ہے لیکن پیغمبر کے لیے حقیقت اولیٰ سے روشناسی اُن نفسیاتی قوتوں کی بیداری کا پیغام ہوتا ہے جو ایک عالم کو ہلا دینے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ نئی قوتوں کی بیداری سے جس دنیا کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس میں پیغمبر کے مذہبی خیالات و احساسات زندہ حقیقت میں تبدیل ہو جانے کے لیے بیتاب ہوتے ہیں"۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نبی کی مراجعت نہ ہو تو اس کے تخلیقی

[1] خطبات صفحہ ۱۲۴

عمل سے جو جان تازہ پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ وہ تشنہ تکمیل رہ
چھوٹے پیمانہ پر یہی حال عام انسانوں کا ہے جو اپنی انفرادیت کی حفا
کرتے ہوئے تکمیلِ کائنات میں معاون ہوتے ہیں۔

(۴) انسانی شخصیت و انسانی ہستی کی اہمیت کو علامہ اقبال اس بات
سے بھی ظاہر کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق وہ
روزِ جزا بھی بالکل الگ اور نمایاں برقرار ہوگی۔ جب کہ ہر شخص
بطور ایک فرد کے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آئے گا اور اپنا نامہ
اعمال دیکھے گا۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ؕ	جتنی مخلوقات آسمان و زمین میں ہے سبھی خدائے رحمن کے آگے عبد بن کر حاضر ہوں گے۔
لَقَدْ اَحْصٰهُمْ وَ عَدَّهُمْ عَدًّا ؕ	خدا نے انھیں اپنی قدرت کے احاطہ میں گھیر رکھا ہے۔ اور ان کو گن رکھا ہے
وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۱۹: ۹۳-۹۵﴾	یہ سب قیامت کے دن فرداً اُس کے حضور میں حاضر ہوں گے۔

وہ اپنے اعمال کا حساب خود دیکھ لے گا اور اُس روز بھی اُس کی
انفرادیت قائم ہوگی:۔

وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ	ہم نے ہر ایک آدمی کی برائی بھلائی کو اس کے ساتھ لازم کر رکھا ہے

لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ؕ

۱۷
۱۳-۱۴

گلے کا ہار بنا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اُس کا نامہ اعمال نکال کر اُس کے سامنے پیش کر دینگے اور وہ اُس کو اپنے روبرو کھلا ہوا دیکھ لے گا (ہم اُس سے کہیں گے) اپنا اعمال نامہ پڑھ لے اور آج اپنا حساب لینے کے لیے تو آپ ہی اپنی کفایت ہے

اقبال کے خیال میں زندگی کی خصوصیت ہی تفرد ہے۔ کائنات افراد کے مجموعہ سے عبارت ہے۔ خدا بھی ایک فرد ہے اور اس صفت کو نمایاں کرنے کے لیے قرآن کریم ذاتِ واجب کو، اللہ، کے خاص نام سے پکارتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ وہ خاص امتیازی صفات کا مالک ہے۔ جن کا نچوڑ قرآن کریم میں صرف چند لفظوں میں یوں پیش کیا گیا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۧ

۱۱۲
۱-۴

(اے پیغمبر) کہو کہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اُس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اللہ اُس کی برابری کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

انفرادیت کی تکمیل لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ میں ہو جاتی ہے جیسا کہ برگسان نے اپنی کتاب[1] میں بتایا ہے کہ انفرادیت کے کئی

[1] Creative Evolution

درجے ہیں اور وہ انسانی ذات میں مکمل نہیں۔ کیونکہ نسلی تخلیق انفرادیت کی مخالف ہے۔ فرد کی حقیقی تکمیل کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا کوئی حصہ اس سے الگ زندہ و قائم نہ رہ سکے۔ لیکن اس صورت میں بقائے نسلی ناممکن ہو جائے گا۔ نسل کے بقا کا مطلب ہی یہ ہے کہ جسم کے کچھ حصہ سے ایک نیا جسم تیار ہو سکے۔ اس طرح بقائے نسل میں انفرادیت اپنے دشمن کو اپنے ہی گھر میں پناہ دیتی ہے۔ لیکن حقیقی طور پر مکمل ترین فرد یا ذات[1] واجب کے لیے ایسے دشمن کو پناہ دینا ناممکن ہے اور یہی ذات کامل کے قرآنی تصور کے مطابق خدا کا نہایت اہم وصف ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں بار بار کیا گیا ہے۔

فارنل[1] نے قرآن کریم میں خدا کو نور کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ سے اللہ تعالٰی کے تفرد کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ویسے بھی مذہب کی تاریخ میں ہمیں کئی ایسے مقام ملتے ہیں جہاں خدا کی انفرادیت سے بچنے اور غیر معین کرنے کے لیے ذات باری کو روشنی یا نور وغیرہ کے لفظوں سے پکارا گیا۔ پوری آیت جس کے صرف کچھ حصہ کا فارنل نے حوالہ دیا ہے۔ یوں ہے:

مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ ۔ ۲۴/۳۵	اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں ایک چراغ رکھا ہے اور چراغ ایک شیشے کی قندیل ہے اور قندیل اس قدر شفاف ہے گویا وہ ایک ستارہ ہے

[1] Farnell

اس آیہ شریفہ کے پہلے فقرہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذات واجب تعالےٰ کا تفرد مطلوب نہیں۔ لیکن جب ہم نور کی تشبیہہ کو باقی عبارت میں دیکھتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے خیال کے بالکل برعکس حقیقت واجب کا تعین کر دیا گیا ہے روشنی کو چراغ کے شعلے میں اور چراغ کو ایک شیشہ میں ظاہر کر کے غیر معین و مبہم کو خارج کر دیا گیا ہے[1]

اللہ تعالےٰ کی لامحدودیت اُس کے تفرد کے منافی یا متضاد نہیں کیونکہ انائے مطلق کی ابدی لامحدودیت اس کی اُس تخلیقی صلاحیت میں ہے۔ جس کا صرف کچھ مظاہر کائنات میں (جیسا کہ ہم اُسے جانتے ہیں) موجود ہے۔ اس تخلیق میں سب سے اہم جزو انسان ہے۔ جو اللہ تعالےٰ کی تجلی کا ظہور ہے۔ پہلے وہ اللہ تعالےٰ کے علم اور تصور میں موجود تھا۔ امر "کُن" کا مخاطب ہو کر خارجاً موجود ہو گیا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے:-

اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ؀ پ ۱۳	جب وہ کسی کام کا کرنا ٹھان لیتا ہے تو بس اُسے فرما دیتا ہے کہ ہو (کُن) اور وہ ہو جاتا ہے۔

اقبال نے انسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے ؎

برگِ کُن فکاں غیر از تو کس نیست
نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بیباک تر نہ در رہِ زیست
بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

"پیامِ مشرق"

[1] اللہ تعالےٰ نے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لیے خلق کو پیدا کر دیا۔

كُنْتُ كَنْزًا مخفيًّا فَاحببتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخلقَ وتعرفتُ اليهم فعرفُوني	میں چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا میں پہچانا جاؤں میں نے مخلوقات کو پیدا کیا اور ان کے سامنے ظاہر ہوا اور انھوں نے مجھے پہچانا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کو ظاہر کرنے کے لیے اپنے خاص علم و تعق میں موجود انسان کو تخلیق کیا۔ یعنی اظہار ذات کے جوش میں اپنے ہی د آبدار کو کنارہ کی طرف پھینک دیا۔ ماہ و انجم کو یہ شکوہ ہے کہ ذات خداوند نے انسانی خاک کو اپنے شرر سے ہمکنار کر دیا ہے

بضمیرت آرمیدم تو بجوش خود نمائی | بکنارہ بر فگندی دُرِ آب دار خود
مہ و انجم از تو دارد گلہ ہا شنیدہ باشی | کہ بخاکِ تیرہ ما زدہ شرار خود را

زبور عجم ۷۵

اسی خیال کو دوسرے شعروں میں پیش کیا ہے ہے

خودی را از وجود حق وجودے | خودی را از نمودِ حق نمودے
نمی دانم کہ ایں تابندہ گوہر | کجا بودے اگر دریا نبودے

ارمغان حجاز ۱۷۲

یہی وجہ ہے کہ اس دُرِ آبدار کی جستجو خدا کو بھی رہتی ہے۔ وفورِ اشتیاق میں وہ مختلف رنگوں میں تمہیں تلاش کرتا رہتا ہے۔ کبھی برگِ لالہ و گل پر اپنا پیغام لکھتا ہے۔ کبھی قمریوں اور عندلیبوں کے سینہ میں اور کبھی نرگس کی صورت ہمہ تن چشم بن کر تمہیں دیکھتا

ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجوست
چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزوست

گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیامِ خویش
گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہ ہاؤ ہوست

در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما
چنداں کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگوست

آہے سحرگہے کہ زند در فراقِ ما
بیرون و اندرون زبر و زیر و چار سوست

ہنگامہ بست از پئے دیدار خاکئے
نظارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بوست

پنہاں بہ ذرہ ذرہ و نا آشنا ہنوز
پیدا چو ماہتاب بہ آغوشِ کاخ و کوست

در خاکدانِ ما گہرِ زندگی گم است
ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست   زبور عجم ۱۲۲

انسان کے خاکدان میں گہر زندگی پوشیدہ ہے۔ یہ گہر زندگی خودی ہے یا خدا؟ ہمارا وجود حق تعالیٰ کی تجلّی کے بغیر ممکن نہیں اور حق تعالیٰ کا ظہور خلق کی صورتوں کے بغیر ناممکن ہے دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

نہ اورا بے نمودِ ما کشودے   نہ مارا بے کشودِ او نمودے

زبور عجم ۲۲۳

لیکن اس کے باوجود انسان اور خدا، خلق اور خالق الگ الگ۔ خودی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ انا رکھنے والے دوسرے وجودوں کے ساتھ اپنا تعلق رکھتی ہے۔ لیکن اپنی اندرونی گہرائی اور باطنی کیفیت میں بالکل الگ ہوتی ہے۔ انسانی خودی کا یہ تابندہ گوہر اس دنیا میں بھی اپنی تشخصیت کو قائم رکھتا ہے اور روزِ جزا بھی الگ اور نمایاں برقرار رہے گا۔ ذاتِ باری کے حضور میں خودی کا دو بدو قائم رہنا اس کا سب سے بڑا امتحان اور انتہائی مرتبہ ہے۔ آلیسے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے:۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ ۷۵ ۲۲-۲۳	اُس دن بہت لوگوں کے) چہرے تر و تازہ اپنے پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے۔

اس حقیقت کو علامہ اقبال نے یوں بیان فرمایا ہے ؎

پیش ایں نور ار بمانی استوار   حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار
برمقامِ خود رسیدن زندگی است   ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

جاوید نامہ ۱۴

روزِ جزا سے پہلے کے نیست کا منظر بھی پختہ کار خودی کے سکون کو متزلزل نہ کر سکے گا۔

وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِيْ	اور صور پھونکا جائے گا تو جو مخلوقات آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے الا

الْأَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ ط سلہ $\frac{۳۹}{۶۸}$	پر بے ہوشی ہو جائے گی سوائے اُن کے جنہیں اللہ چاہے ۔

انسان کے ذاتِ الٰہی سے علیحدہ وجود قائم رکھنے کے متعلق علامہ اقبال نے جہاں عقلی دلائل پیش کیے ہیں (جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) وہاں شاعرانہ رنگ میں بھی مسئلہ وصال و فراق کے ماتحت اس سوال پر بحث کی ہے فراق کو کسی قیمت پر چھوڑا نہیں جا سکتا ۔ حتےٰ کہ اُس کا وصال میں بھی باقی رہنا ضروری ہے جدائی عشق کا آئینہ دار ہے اور اِس سے خاک کو بھی نگاہ میسّر ہو جاتی ہے ۔ فراق سے خودی مستحکم ہوتی ہے ۔ اللہ تعالےٰ کی جدائی یا ذاتِ الٰہی کے حضور میں خودی کا موجود و قائم رہنا انسان کے لیے بہت بڑا محرکِ عمل ہے ؎

ازو خود را بریدن فطرتِ ماست	تپیدن نارسیدن فطرتِ ماست
نہ ما را در فراقِ او عیارے	نہ او را بے وصالِ ما قرارے
نہ او بے ما نہ ما بے او چہ حال است	فراقِ ما فراق اندر وصال است
جدائی خاک را بخشد نگاہے	دہد سرمایۂ کوہے بکاہے !
جدائی عشق را آئینہ دار است	جدائی عاشقاں را سازگار است
من و او چیست ؟ اسرارِ الٰہی است	من و او بر دوامِ ما گواہی است
بخلوت ہم بجلوت نورِ ذات است	میانِ انجمن بودن حیات است
چہ سودا در سرِ ایں مشتِ خاک است	ازیں سودا درونش تابناک است
چہ خوش سودا کہ نالد از فراقش	ولیکن ہم بنالد از فراقش

سلہ لمعات صفحہ ۱۱۶

فراق او چناں صاحب نظر کرد   کہ شام خویش را بر خود سحر کرد

زبورِ عجم ۲۲۰

اقبال کا یہ نظریہ جس پر ہم نے بحث کی ۔ ہیگل اور اربابِ وحدت الوجود کے خیال سے مخالف ہے ۔ اُن کے خیال میں انسان کے لیے سب سے بڑا مقام یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی مٹا کر حیاتِ کلی یا خدا میں جذب ہو جائیں ۔ یعنی انسان کی انا دمقابہ حق تعالےٰ کی انا مطلق میں فنا ہو جائے ۔ لیکن اقبال زیادہ سے زیادہ انفرادیت پیدا کر کے اپنی ہستی کو قائم رکھنا چاہتا ہے ۔

اب ہم خودی کی بحث کے ایک نہایت اہم پہلو پر پہنچتے ہیں جسے یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ کیا خودی کی ایسی تکمیل ممکن ہے جو انسان کو ذاتِ واجب کے حضور میں بھی اپنا وجود قائم رکھنے کی قوت و طاقت دے سکے ۔

اس کے متعلق اقبال کا جواب اثبات میں ہے ۔ خطبات میں لکھتے ہیں ۔ کہ " جو لوگ اس کو مشکل یا ناممکن سمجھتے ہیں ۔ وہ دراصل ذاتِ مطلق کے تصور میں غلط فہمی کا شکار ہیں ۔ مطلق حقیقی سے مراد لا محدود وسعت نہیں کیونکہ وسعت کا ایسا تخیل تمام محدود وسعتوں کو گھیر لے گا حقیقتِ مطلق وسعت (Extensity) کی بجائے بے پایانی اور شدت (Intensity) میں پنہاں ہے جب ہم اس بے پایانی کا خیال کرتے ہیں تو ہمارے لیے محدود خودی کا ایسا تصور ممکن ہو جاتا ہے جو ذاتِ مطلق سے

ک اور علیحدہ قائم رہتی ہے گو وہ اُس سے بالکل بے تعلق نہیں ہو جاتی۔ قولِ الذکر تصوّر کے مطابق میری ذات وسعتِ زمان و مکان میں مدغم ہو جاتی ہے۔ لیکن مؤخر الذکر طریق پر میں زمان و مکان کے اسی اسلوب کو اپنے سے الگ دو بارہ دیگرے کے طور پر قرار دیتا ہوں۔ میں اُس سے الگ ہوں لیکن جس پر میں اپنی زندگی اور بقا کا دارومدار رکھتا ہوں۔ اُس سے میرے گہرے تعلقات بھی ہیں[1]"۔

انسانی شخصیت کو اس قدر اہمیت دینے کے باوجود اسلام شخصیت پرستی کے خلاف ہے۔ علامہ اقبال نے شخصیت پرستی کی مخالفت کا بہترین مظہر اسوۂ رسولؐ کو قرار دیا ہے۔ آپ کا فرمان ہے: "اسجدوا اللّٰہ اکرموا اخواتکم"۔ بزرگوں کی محض واجبی تعظیم کرو۔[2] سجدے کے لائق صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ علامہ مرحوم فرماتے ہیں کہ دنیا بھر کی ادبیات میں اس سے بہتر فقرہ مجھے دیکھنا نصیب نہیں ہوا[3]۔ اس ایک فقرہ میں توحید کا اثبات اور شخصیت پرستی کی نفی ہر دو کو یکجا کر کے گویا سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

اقبال کے نظریہ کے مطابق زندگی مستقل فعلیت ہے جس میں

---

[1] خطبات صفحہ ۱۱۸

[2] بنو اسرائیل میں سجدۂ تعظیمی جائز تھا۔ لیکن اسلام نے توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانے کے لیے سجدۂ تعظیمی منع کر دیا۔

[3] ملفوظاتِ اقبال صفحہ ۱۷۶

سکون و ثبات نہیں ہے۔ ہر لمحہ تغیر واقع ہوتا رہتا ہے ؎

فریب نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

بال جبریل ۱۷۱

اس مستقل فعلیت کی زندگی میں تکمیل خودی کی پوری آزادی ہے
اگر کائنات مکمل صورت میں پہلے سے ہی موجود ہوتی۔ جس میں تبدیلی
ایزادی کی گنجائش نہ ہوتی۔ تو انسان کے لیے ترقی کے مواقع بھی نہ ہوتے
اور قرآن پاک میں اس کے پاک کرنے یا پراگندہ کرنے کا ذکر نہ ہوتا

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ۝

$\frac{91}{8-10}$

اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو اس کی بدکاری اور پرہیزگاری سے آگاہ کر دیا جس نے اس کو پاک کیا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اس کو دبا دیا وہ نامراد ہوا۔

زندگی کی اصل قیمت اس کے پیہم رواں اور ہر دم رواں ہونے میں
ہے۔ اسی طرح انسان اپنی دنیا آپ پیدا کر سکتا ہے ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی!

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی!

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی بانگ درا ۲۹۳

اقبال نطشے کے خیال سے متفق نہیں کہ دنیا کا نظام پہلے ہی مکمل صورت میں موجود ہے اور ابدی تکرار[1] کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔ اس صورت میں ہم عروج پہ پہنچ کر پھر نئے سرے سے زندگی کے منازل طے کرتے ہیں اور یہ لامتناہی سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ نطشے کے اس نظریہ کی ابتدا ہربرٹ سپنسر کے خیالات میں بھی پائی جاتی ہے نطشے کے خیال میں جو کچھ اب ہو رہا ہے۔ وہ پہلے بھی لاتعداد دفعہ ہو چکا ہے اور مستقبل میں بھی لاتعداد بار ہوگا واقعات میں تکرار کی خاصیت پیدا ہو چکی ہے اور یہ حلقہ جس میں انسان ایک ذرہ کے برابر ہے ہمیشہ چکر کاٹتا رہے گا۔

اس پر ہم یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اگر انسان نے مقررہ عرصہ کے بعد پھر عروج سے ابتدا کو لوٹ کر زندگی کا چکر شروع کرنا ہے تو وہ کس مقصد کے حصول کی خواہش کر سکتا ہے اُسے یہ معلوم ہو کہ انجام آخر کار پھر ابتدا ہی ہوگی اس کے لیے زندگی کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ اس لیے اقبال نے لکھا ہے کہ میرے خیال کے مطابق یہ امر قرآنی تعلیم کے بالکل مخالف ہے کہ نظام

[1] Nietzche's Eternal Recurrence

کائنات ایک مقررہ تجویز کے مطابق زمان و مکان کی وسعتوں میں آ بیٹھے بے جان مادہ کی صورت میں موجود ہے۔ جو مدتوں پہلے اپنے خالق کے ہاتھ تکمیل پذیر ہو چکا ہے اور جس پر زمانہ کی رفتار کا نہ کوئی اثر ہے اور نہ اس کی حقیقت"[1]

انسان ہمیشہ کسی نئی چیز کے حصول کی خواہش میں ترقی کر سکتا ہے لیکن نطشے کے نظریہ کے مطابق 'جا بیدا' کا تصور ہی ناممکن ہے۔ اس کا یہ تصور انسان کو زندگی کی جدوجہد کے لیے تیار کرنے کی بجائے اس کی خودی اور اس کی فعلیت کو کمزور کرنے والا ہے[2]۔

نظام کائنات کا اسلامی نقطۂ نظر تکرار نہیں۔ جو میکانکی عمل ہے اسلامی نظریہ تخلیق کا ہے۔ ایسی تخلیق جس میں نظم ہے۔ لیکن کائنات میں نظم ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ایک گھڑی کی مانند ہے جس کو ایک دفعہ کوک دیا گیا اور وہ ہمیشہ کے لیے چلی جا رہی ہے۔ قرآن کریم کے مطابق کائنات حرکیاتی ہے۔ سکونی یا میکانکی نہیں نطشے کا نظریہ محض میکانکی ہے اور یونان قدیم کا تصور سکونی تھا۔ اس کے مطابق کائنات شروع میں جس طرح بنی تھی اسی طرح ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ خطبات میں ابن خلدون کے زمان کے نظریے پر بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ اس نے دراصل یونانی خیالات کے مقابلہ میں قرآن کی حقیقت کو ظاہر کیا ہے۔ یونانی یا تو زمان کی حقیقت کے قائل ہی نہ تھے۔ جیسا کہ افلاطون و زینو[3] کا عقیدہ تھا۔ یا ان کے

---

[1] خطبات صفحہ ۵۶ [2] تفصیل کے لیے خطبات صفحہ ۱۱۵ [3] Zeno

نزدیک زمانہ ایک دائرے کی طرح گردش کرتا ہے جیسا کہ ہراقلیطس[1] اور رواقیین[2] کا خیال ہے۔

تخلیقی عمل کے ارتقائی مدارج کو اگر دوری حرکت کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ تو تخلیق کی نفی ہو جاتی ہے۔ ابدی چکر کو ابدی تکرار کا نام تو دیا جا سکتا ہے لیکن اسے ابدی تخلیق نہیں کہہ سکتے تخلیق تکرار کی ضد ہے[3]

قرآن کریم میں کائنات میں اضافہ ہونے کا ذکر ہے:

يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ط — جو چاہتا ہے خلق میں زیادہ کر دیتا ہے۔

۳۵/۱

اللہ تعالے مخلوق پیدا کرتا رہتا ہے اور پیدا کرنے کے بعد تخلیق سے غافل نہیں ہو گیا ہے

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

بال جبریل ۴۴

اس کائنات کا خالق وہ ہے جس کے متعلق ارشاد ہے:۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ج — ہر روز وہ ایک شان میں ہے۔

۵۵/۲۹

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں — ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

پیام مشرق ۱۰۸

اس کائنات میں ترقی و اضافہ کے رستے کھلے ہیں اور اس کی

---

1. Heroclitus or ۲۴۰ ق م ۔ 2. Stoics 3. خطبات صفحہ ۱۴۲

اندرونی گہرائیوں میں ایک نئی زندگی کا راز مضمر ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۭ ۲۹/۲۰	کہو کہ تم ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ خدا نے کس طرح اول بار مخلوق کو پیدا کیا اور پھر اللہ ہی پچھلی پیدائش کو پیدا کرے گا۔

علامہ مرحوم فرماتے ہیں ؎

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیر جہان دگر است
پیام مشرق ۲۳۱

قرآن کریم میں بھی اس کی شہادت ہے۔

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ ۵۰/۱۵	کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے میں تھک گئے ہیں۔ یہ لوگ نئی پیدائش کی طرف سے شک میں ہیں۔

حق تعالیٰ ہر لحظہ نئی تخلیق کرتا رہتا ہے۔ اس کا وجود اظہار ذات میں ہے نہ کہ کسی منتہائے نظر کے حصول میں [1]۔ تخلیق ماضی کا کوئی مخصوص فعل نہیں اور نہ ہی کائنات کوئی ایسی تیار شدہ چیز ہے جس کا بنانے والا اب محض تماشائی کی حیثیت سے اسے دیکھ رہا ہے۔ حقیقت میں تخلیق کے متعلق تمام مذہبی بحث ایسی تنگ نظری کی وجہ سے ہے کائنات کو ایک حادثہ سے زیادہ وقعت نہیں دیتی۔ اس نظریہ

[1] خطبات صفحہ ۶۱

مطابق اگر یہ حادثہ رونما نہ ہوتا اور کائنات کی تخلیق نہ ہوتی تو بھی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ ہم کائنات کو اللہ تعالےٰ سے الگ حیثیت نہیں دے سکتے جو لامحدود مکانیت میں خالق کے بالمقابل زاد بالکل علیحدہ وحدت کے طور پر کارفرما ہوئے

ایسی کائنات میں جس کا اوپر بیان ہوا۔ انسان مستقل اور بنیادی عنصر ہے:۔

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًی ؕ اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ۙ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ۙ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰی ؕ اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یُّحْیِ ـَۧ الْمَوْتٰی ۧ

۷۵
۳۶-۴۰

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اُس کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا کیا وہ (ابتدا میں) منی کا ایک قطرہ نہیں تھا کہ شکم میں ڈالی جاتی تھی پھر لوتھڑا ہوا اور پھر خدا نے اُس کو پیدا کیا اور تندرست کیا۔ اُس کی دو قسمیں کیں۔ مرد اور عورت کیا وہ (قیامت میں) مردوں کو جلا اُٹھانے پہ قادر نہیں ہے۔

انسان اپنے اندر بے پناہ قوتیں رکھتا ہے ؎

انجم تا بہ انجم صد جہاں بود | خرد ہر جا کہ پر زد آسماں بود
ولے چوں بخود نگرستیم من | کرانِ بیکراں در من نہاں بود

پیام مشرق ۸۹

انسان کا اہم حصّہ کائنات کے اضافہ اور جہانِ دیگر کی تعمیر ہے۔ نامکمل کائنات کے عمل تخلیق میں وہ شریک ہے اور علامہ اقبال کے الفاظ میں خدا کی تمام مخلوق میں صرف انسان ہی اس قابل ہے کہ شعوری طریق پر اپنے خالق کی حیات تخلیقی میں شریک ہو سکے۔ اس میں یہ جوہر پیدا کیا گیا ہے کہ وہ ایک بہتر دنیا کا تصوّر کر سکے اور جو کچھ موجود ہے اُسے وہ بنا دے۔ جو اُسے ہونا چاہیئے" [1]

قرآن کریم میں خدا تعالےٰ کو اَحسَنُ الخَالِقِینَ [2] کہہ کر دوسرے خالقوں کے امکان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انسان جس قدر کائنات کے غیر منظم حصہ میں ربط پیدا کرتا ہے اُسی حد تک اُس کو عمل تخلیق میں شامل قرار دیا جاتا ہے۔

زندگی فانی ہونے کے ساتھ باقی بھی ہے اور اس میں خلاقی کا عنصر بہت اہم ہے۔ جو انسان قوّتِ تخلیق سے بے بہرہ ہے۔ اُس نے شجر زندگی کا پھل نہیں کھایا ہے

زندگی ہم فانی و ہم باقی است — این ہمہ خلاقی و مشتاقی است
زندہ ؟ مشتاق شو خلاق شو — ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو
ہر کہ او را قوّتِ تخلیق نیست — پیش ما جز کافر و زندیق نیست

جاوید نامہ ۲۲۵

اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہو کر انسان کائنات میں نظم و ربط پیدا کرتا ہے۔ انسان خدا تعالےٰ کو کہتا ہے ؎

---

[1] خطبات صفحہ ۲، [2] قرآن حکیم ۲۳/۱۴، ۳۷/۱۲۵

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

پیام مشرق ۱۳۲

پھول کی پتی کی طرح نحیف انسان اپنے سخت فرائض کے مقابلہ میں اندرونی قوتوں کے لحاظ سے بے پناہ طاقت کا مالک ہے قرآن کریم کے مطابق انسان اپنی اندرونی گہرائیوں میں ایسا تخلیقی عمل رکھتا ہے۔ جو اُسے جادۂ ترقی پر ایک حالت سے دوسری میں (طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ) بڑھاتا چلا جاتا ہے:۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ؕ ۸۴ – ۱۹ – ۱۶	ہم کو شفق کی قسم ہے اور رات کی اور ان کی جن پر رات چھا جاتی ہے اور چاند کی جب پورا ہو۔ کہ تم لوگ درجہ بدرجہ بڑھتے چلے جاؤ گے۔

انسان کے لیے ترقی ضروری ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا:۔
من اسْتَوٰی یَوْمَاہُ فَھُوَ مَغْبُوْن کہ جس شخص کے دو دن ایک ہی حالت میں گزر گئے (یعنی اس نے کوئی ترقی نہ کی) وہ نقصان میں رہا۔
اگر انسان کا امروز بھی دوش کی تصویر ہو تو اُسے زندہ کہنا نامناسب ہے

دمادم نقش ہائے تازہ ریزد　　　بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویرِ دوش است　　　بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

پیام مشرق ۲۹

کائنات کی گہری آرزوؤں میں شریک ہوکر اپنی اور کائنات کی تقدیر کی تشکیل کرنا انسان کا کام ہے ۔ علامہ مرحوم نے اپنی نظم "تسخیرِ فطرت" میں اس خاک کے پتلے آدم کی قوتوں کا ذکر نہایت دلکش انداز میں کیا ہے آدم کی تخلیق میں حق تعالےٰ نے تمام قسم کی قوتیں پیدا کردیں جن سے فرشتے بھی محروم تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی شخصیت کے وجود میں آنے سے کائنات ہستی میں ہنگامہ مچ گیا ۔ سکون و خاموشی کی جگہ عشق کی گہما گہمی نے لے لی حُسن تھرّا گیا اور آرزو نے آغوشِ حیات میں آنکھ کھولی تو جہانِ دیگر سے روشناس ہوئی ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے ، خود شکنے ، خودنگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

زندگی گوئت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد پیام مشرق ۹۷

انسان کی قوت تسخیر کا ذکر فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے وقت اِن الفاظ میں کرتے ہیں ؎

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

بال جبریل ۱۷۷

انسان کی یہ قوت ناموافق حالات کو بھی اُس کے تابع ہونے پر مجبور کر دیتی ہے اس حقیقت کبریٰ کے اظہار کے لیے قرآن شریف میں حضرت یوسف کے حالات کا بیان ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماحول کے ناموافق حالات کو آخرکار ایک فرد کے ذاتی جوہر کے تابع ہونا پڑتا ہے۔ سچ تو یہ

ہے کہ انسانی جوہر کی قوت کا صحیح اندازہ کبھی تب ہی ہو سکتا ہے جب ناسازگار حالات کا مقابلہ حق و صداقت سے کیا جائے۔ مومن ناسازگار دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنا عالم اور پیدا کر لیتا ہے ؎

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟ گفتم کہ نمی سازد! گفتند کہ برہم زن

جاوید نامہ ۱۹۶ نیز زبورِ عجم ۱۰۶

حدیثِ بے خبراں ہے، تو با زمانہ بساز

زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز

بالِ جبریل ۲۶

درشکن آں را کہ ناید سازگار از ضمیرِ خود دگر عالم بیار

مردِ حق! برندہ چوں شمشیر باش

خود جہانِ خویش را تقدیر باش جاوید نامہ ۲۲۵

علامہ اقبال کے مندرجہ بالا کلام میں ہمیں اُن کا یہ خیال دکھائی دیتا ہے کہ انسان خود اپنے مقدر اور کائنات کی تقدیر کی تشکیل کی قوت رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے یا مختار۔ شروع زمانہ سے اب تک مذہب و فلسفہ کا ایک مشکل عقدہ بنا رہا ہے اور دونوں فریق اپنے حق میں مختلف دلائل پیش کرتے رہے ہیں[1] اس لیے مناسب ہوگا کہ مسئلہ جبر و

---

[1] اس موضوع پر اسلامی مفکرین کے خیالات کا خلاصہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی انگریزی کتاب Metaphyses of Rumi کے چھٹے باب میں موجود ہے۔ انھوں نے معتزلہ، اشعریہ، الغزالی اور رومی وغیرہ کے خیالات پر روشنی ڈالی ہے۔

اختیار کو کچھ وضاحت سے بیان کیا جائے - پہلے ہم قائلان جبر کے چند ایک دلائل درج کرتے ہیں ان کی اساس جن آیات و اقوال پر ہے اُن میں سے چند ایک نیچے درج کیے جاتے ہیں :-

(۱) وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ - ۳۷/۹۶	اللہ نے پیدا کیا تمھیں اور جو کچھ تم کرتے ہو۔
۲- اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۵۴/۴۹	ہم نے تمام چیزوں کو ایک اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے۔
۳- قَدْ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ	تقدیر کا قلم جو ہونے والا ہے وہ لکھ کر خشک ہو گیا۔
۴- لَا يُؤْمِنُ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ وَحَتّٰى يَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَهٗ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَهٗ وَاَنَّ مَا اَخْطَأَهٗ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَهٗ۔	وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک تقدیر خیر و شر پر ایمان نہ رکھے اور یہ نہ جان لے کہ جو مصیبت اُسے پہنچی وہ چوک نہ سکتی تھی اور جو اُس سے چوک گیا وہ اُسے پہنچ نہیں سکتا تھا۔

اِن سے قائلانِ جبر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان مجبورِ محض ہے اور اس کی کوشش فضول ہے - اس کا جواب علامہ اقبال کی زبان سے دینے سے پہلے ہم اُن کے مرشد رومی کے چند نکات پیش کرتے ہیں - مولانا نے مثنوی میں اس مسئلہ کو عام فہم مثالوں سے واضح کیا ہے مولانا ایک آتش

پرست کا ذکر کرتے ہیں جس کو کسی نے مسلمان ہو جانے کو کہا۔ آتش پرست نے جواب دیا کہ خدا قادر مطلق ہے۔ اس لیے اگر وہ چاہتا تو میں مسلمان ہو جاتا۔ چونکہ وہ ایسا نہیں چاہتا۔ اس لیے میں کس طرح مسلمان ہو سکتا ہوں اس کا جواب مولانا ان مثالوں سے دیتے ہیں کہ کبھی کسی نے اندھے کو نہیں کہا کہ تو دیکھ۔ کوئی شخص پتھر کو نہیں کہتا۔ کہ تو دیر سے آیا۔ اگر چھت سے کوئی لکڑی ٹوٹ کر کسی کے اوپر گر پڑے۔ تو وہ لکڑی کا دشمن نہیں بن جاتا ہوا آئے اور پگڑی اڑا لے جائے تو انسان اُس سے ناراض نہیں ہوتا ناراضگی اُسی سے ہوتی ہے جسے ہم صاحبِ اختیار سمجھتے ہیں۔ اسی طرح "جو خدا چاہتا ہے ہوتا ہے" سے مراد یہ نہیں کہ انسان ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ وزیر جو چاہتا ہے ہو جاتا ہے تو سب انسان یہ کوشش کرتے ہیں کہ وزیر کو خوش کر کے خدمت کا انعام حاصل کریں اگر خدا کا حکم ہمیشہ کے لیے ہے تو ہمیں زیادہ مستعدی سے اس کے احکام کی تعمیل میں سرگرم ہونا چاہیئے۔ اسی طرح سے قد جف القلم سے بھی عمل ہی کی دعوت ملتی ہے۔ حقیقت میں قدرت کا قلم یہ لکھ کر خشک ہو گیا۔ کہ اگر انسان ٹیڑھا چلے گا تو نتیجہ بھی ایسا ہی ہوگا اور اگر سیدھا چلے گا تو نتیجہ بھی اچھا نکلے گا۔ قلم یہ لکھ کر خشک ہو گیا کہ اگر تو چوری کرے تو تیرا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اگر تو شراب پئے گا تو نتیجہ خراب ہوگا۔ اگر انسان یہ خیال کرے۔ کہ ہونے والی سب باتیں لکھ کر خدا معزول ہو کر بیٹھ رہا تو یہ اس کی بڑی غلطی ہے جف القلم کا مطلب یہ ہے کہ جفا کا نتیجہ جفا اور وفا کا نتیجہ

وفا ہوگا ؛ قرآن کریم میں ہے :

وَ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ ۶۵/۳	اور اُس کو اُس جگہ سے رزق دے گا جس سے اُسے گمان بھی نہیں ۔

بعض لوگ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہماری کوشش بیکار ہے ۔ جب خدا تعالٰے نے ایسے ذریعہ سے رزق دینا ہے جو ہمارے خیال میں بھی نہیں ۔ اس کے متعلق بھی مولانا نے لکھا ہے کہ کوشش لازم ہے مثلاً اگر کسی درزی کو اپنے کام میں رزق کی کشائش حاصل نہیں ہوتی اور پھر زرگری میں ہو جاتی ہے ۔ یہ پیشہ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا ۔ اگرچہ اُس کی زرگری میں کشائش بھی اُس کی اُس محنت و مشقت کی عادت کا نتیجہ ہے ۔ جو اُس نے درزی کے کام میں کی ۔

اس کے علاوہ مولانا فرماتے ہیں کہ ہم بُرا کام کر کے پشیمان ہوتے ہیں ۔ یہ اختیار کی دلیل ہے اگر ہمارے لیے ایک ہی راستہ ہوتا تو پشیمان ہونے کی کیا ضرورت تھی ۔ تمام قرآن امر و نہی وعدہ وعید سے بھرا ہوا ہے ۔ اگر انسان میں اختیار نہ ہوتا تو ان کی کوئی وقعت نہ تھی ہر ایک کو اُس کے کیے کے مطابق جزا سزا کا ذکر قرآن کریم میں بار بار آتا ہے ۔ جن میں سے صرف چند ایک حوالے درج کیے جاتے ہیں ۔

وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔ ۳/۲۴	ہر جی کو جو اُس نے کمایا ہے پورا پورا دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ۴۲/۳۰	اور تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کی کمائی کا بدلہ ہوتا ہے۔
لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ ۱۰/۲۶	جنھوں نے بھلائی کی اُن کے لیے بھلائی ہے اور مزید برآں بھی
مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ ۴۰/۴۰	اور جس نے برائی کی ہے وہ اس کے برابر ہی بدلہ پائے گا۔
فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۚ ۹۹/۷-۸	جو ذرہ برابر بھلائی کرے گا تو اُس کا پھل پائے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا تو بھی اُس کا نتیجہ پائے گا۔
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۴/۴۰	اللہ تعالٰی کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔

اِس پس منظر کے ساتھ علامہ اقبال کے خیالات کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوگی۔ اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل' میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ "لفظ تقدیر کو مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں میں غلط طور پر سمجھا گیا ہے۔ قرآن کریم کی زبان میں تقدیر سے مدعا اور کچھ نہیں بلکہ وہ زمانہ ہے۔ جو ابھی امکان میں ہو۔ جب ہم زمانہ پر اُس حالت

میں نظر ڈالیں۔ جب اُس کے جملہ امکانات ابھی ظاہر نہ ہوئے ہوں تو اُسے تقدیر کہا جائے گا۔ قرآن کریم میں۔

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۲۵/۲	اللہ تعالےٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کی تقدیر مقرر کی۔

کا یہی مطلب ہے کہ خدا نے ہر شے کی فطرت میں ایسے امکان رکھ دئے ہیں۔ جو بغیر کسی خارجی دباؤ کے عمل میں آتے رہتے ہیں[1]۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ "اگر ہم حیات اور کائنات کو تقدیر کے عام فہم معنوں میں پہلے سے مقرر شدہ حقیقت تسلیم کریں تو نہ صرف انسان کی آزادی بلکہ ذات باری تعالےٰ کی آزادی بھی برقرار نہیں رہ سکتی اور اس صورت میں ہماری دنیا آزاد۔ ذمہ دار اور اخلاقی انسانوں کی نہیں بلکہ کٹ پتلیوں کی تماشہ گاہ ہوگی" اسلامی تمدن میں انفرادی ذمہ داری کو بہت اہمیت حاصل ہے اس سے ہماری عملی قوتیں اجاگر ہوتی ہیں اور عمل کے نئے چشمے اُبلتے ہیں۔ انسان نئے نئے حقائق کی تخلیق کر سکتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اسی انفرادی ذمہ داری کو قائم کرنے کے لیے حق و باطل کی تمیز انسانی فطرت میں ودیعت کر رکھی ہے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۹۱/۸ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۹۱/۹ قَدْ خَابَ مَنْ	اللہ تعالےٰ نے نفسِ انسانی کو اس کی بدکرداری و پرہیزگاری (کے نتائج) سے آگاہ کر دیا۔ جس نے اپنے نفس کو پاک وصاف رکھا وہ فلاح

[1] خطبات صفحہ ۱۵

د شہاب۔ ۹۱/ ۱۰-۸ یاب ہوا اور جس نے دبا کے رکھا وہ نامراد ل

تقدیر کے اس نظریہ کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم "زمانہ" کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھیں ؎

تو کہ از اصل زماں آگہ نہ ... از حیاتِ جاوداں آگہ نہ

علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں "زمان" کی حقیقت پر بہت زور دیا ہے اور اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے قرآن کریم سے بھی بہت سی آیات پیش کی ہیں۔ اُن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

یُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۚ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ۔ ۲۴/۴۴ — اللہ تعالےٰ رات اور دن کا ردّ و بدل کرتا رہتا ہے۔ سوجھ رکھنے والوں کے لیے اس میں بڑی عبرت ہے۔

اِنَّ فِیْ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ۱۰/۶ — جو لوگ خدا کا ڈر مانتے ہیں۔ اُن کے لیے رات اور دن کے ردّ و بدل میں اور جو کچھ خدا نے آسمان و زمین میں پیدا کیا ہے اس میں خدا کی قدرت کی بہتیری نشانیاں موجود ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۔ ۲۵/۶۲ — وہی قادر مطلق ہے جس نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک آتے جاتے رہیں (اور یہ سب کچھ اُن لوگوں کے لیے بنایا) جو غور کرنا چاہتے ہیں

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَ یُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی	(خدا کی) شکر گزاری کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کیا تو نے (اس بات پر) نظر نہیں کی کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں اور اسی نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے ہر ایک وقت مقررہ تک اسی طرح چلتا رہے گا۔

۳۱/۲۹

قرآن کریم کے ان ارشادات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ لیل و نہار کا اختلاف اللہ تعالےٰ کی دقیع ترین آیات میں سے ہے اور زمانہ کی خاموش پر اسرار رفتار جو ہم انسانوں کو رات اور دن کے ظہور میں دکھائی دیتی ہے۔ خدا کے زبردست مظاہر قدرت میں سے ہے۔ اور اس کا سمجھنا اس لیے ضروری ہے کیونکہ اس کا تعلق براہ راست تقدیر سے ہے۔ یہ زمانہ ہی ہے جو اشیاء کے پوشیدہ امکانات کو بروئے کار لاتا ہے۔ اسی لیے رسول اکرم نے فرمایا۔

لَا تَسُبُّوا الدَّھْرَ فَاِنَّ الدَّھْرَ ھُوَ اللّٰہُ	زمانہ کو برا مت کہو۔ بے شک زمانہ اللہ ہے[1]

[1] علامہ اقبال نے گول میز کانفرنس سے واپسی پر فرانس کے مشہور فلسفی برگسان سے ملاقات کی۔ اُسے گٹھیا کی شکایت تھی۔ اس لیے پہیوں والی کرسی پر بیٹھا تھا اور نوکر کرسی کو ضرورت کے وقت ادھر اُدھر لے جاتا تھا۔ ان کے متعلق بات چیت ہوئی (باقی اگلے صفحہ پر)

زمانہ کا خط پہلے سے کھنچا ہوا موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس خط کی کشش جاری رہتی ہے اور اسی کے ذریعہ زندگی کے امکانات حقیقت بن کر ظاہر ہوتے رہتے ہیں[1]۔ مستقبل پہلے سے کوئی مقررہ چیز نہیں بلکہ امکان کی طرح موجود ہے اور ساتھ ساتھ بنتا رہتا ہے۔ زمانہ الگ الگ لمحوں سے ترتیب نہیں ہے۔ دوش و فردا کا امتیاز ہم نے خود پیدا کر کے اپنے ہاتھوں اپنا زنداں تیار کر لیا ہے ؎

وقت را مثلِ مکاں گستردۂ امتیازِ دوش و فردا کردۂ
اے چو بُو رم کردہ از بستانِ خویش ساختی از دستِ خود زندانِ خویش

اسرار ۸۲

جب انسان اس امتیاز سے بالا ہو جاتا ہے تو وقت اس کے ہاتھوں میں تلوار بن جاتا ہے[2]۔ یہی تلوار حضرت موسٰے کے پاس تھی اور یہی پنجۂ حیدرؓ میں ؎

در کفِ موسٰے ہمیں شمشیر بود کارِ او بالا تر از تدبیر بود
سینۂ دریائے احمر چاک کرد قلزمے را خشک مثلِ خاک کرد

بقیہ نوٹ صفحہ (۲۵۱) تو علامہ نے برگساں کو حضورؐ کی یہ حدیث سنائی۔ وہ اس کو سنتے ہی بے اختیار کرسی سے اُچھل پڑا اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھنے لگا کہ کیا یہ سچ ہے؟

[1] تفصیل کے لیے خطبات صفحہ ۵۵ سے ۶۰

[2] حضرت امام شافعیؒ کا مقولہ ہے: "الوقتُ سیفٌ"۔

پنجۂ حیدرؓ کہ خیبر گیر بود ۔۔۔ قوّت او از ہمیں شمشیر بود

اسرار ۸۰

زمانہ ایک ماکل ہے جس میں ماضی پیچھے نہیں رہ جاتی ۔ بلکہ ساتھ ساتھ حرکت کرتی ہے اور حال میں اثر پذیر ہوتی ہے ۔ ہمارے سامنے مستقبل مکمل اور مقررہ طور پر موجود نہیں ۔البتہ اُس کے جملہ امکان کھلے طور پر اُس کی فطرت میں موجود ہمارے سامنے ہیں ۔ زمانہ کا یہی تصور ہے جسے قرآن کریم تقدیر کے لفظ سے پکارتا ہے ۔ تقدیر زمانہ کی اُس کیفیت کا نام ہے جو اس کے امکان ظاہر ہوتے سے پہلے ہوتی ہے ۔ یہ زمانہ کی اُس کیفیت کا دوسرا نام ہے جب اُسے علت و معلول کے بندھنوں سے آزاد کر دیا جائے ۔ یا مختصر طور پر ہم اُسے یوں بیان کر سکتے ہیں کہ یہ زمانِ محسوس ہے نہ کہ وہ جس کا ہم محض فکر کرتے ہیں یا حساب لگاتے ہیں ۔ مثال کے طور پر ہمایوں شاہِ ہند و طہماسپ شاہ ایران کے ہمعصر ہونے کی وجہ یہی بیان کی جا سکتی ہے کہ مستقبل کے بے شمار امکانات میں ہمایوں و شاہ طہماسپ کی زندگیوں کے امکان بھی موجود تھے کہ وہ ایک ساتھ وقوع پذیر ہوں ۔

زمانہ کو جب تقدیر سمجھا جائے تو وہ اشیاء کی ماہیت بن جاتا ہے غرضیکہ کسی چیز کی تقدیر ایسا نہ ٹلنے والا معتوم نہیں ہے جو خارج سے جبری طور پر اس پر عاید کیا جا رہا ہے بلکہ وہ اس چیز کی اندرونی پہنچ کا نام ہے اس کے ان امکانات کا نام ہے جو اس کی فطرت کی اندرونی گہرائیوں

میں پوشیدہ ہیں اور جن کا حاصل کرنا ہر طرح سے ممکن ہے اور جو متواتر بغیر کسی خارجی دباؤ کے عمل پذیر ہوتے رہتے ہیں اگر زمان کی کوئی حقیقت ہے اور یہ محض لمحات کا تکرار نہیں تو حقیقت کی طرح اس کا ہر لمحہ بھی تخلیقی ہونا چاہیئے۔

زمان کو لمحات میں تقسیم کر دینے سے دراصل ہم اُسے مکان سے وابستہ کر دیتے ہیں ایسی صورت میں ہم زمانہ کے محکوم ہو جاتے ہیں۔ مقید بالمکان زمانہ ہمارے لیے زنجیر بن جاتا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے زمان کو جب ہم محض لمحات کا تکرار قرار دیتے ہیں تو وقت کو ایک دائرے کی صورت میں گزرتا ہُوا تصوّر کرتے ہیں۔ یہی تصوّر نطشے کا تھا جس نے یہ قرار دیا کہ جو کچھ اب ہو رہا ہے۔ وہ پہلے بھی لاتعداد دفعہ ہو چکا ہے اور مستقبل میں بھی لاتعداد بار ہوگا۔ اقبال کا وقت کا تصوّر اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے مطابق وقت کی کشش جاری ہے، زندگی مسلسل تخلیق ہے یہ عمل آزاد ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف تکرار میکانکی عمل سے آگے نہیں بڑھتا۔ اسی لیے تخلیق کو تکرار کی ضد قرار دیا ہے[1]۔

زمان کو حقیقی قرار دینے اور زندگی کو زمان میں ایک مسلسل حرکت کے طور پر سمجھنے کے لیے ابن خلدون کا نظریۂ تاریخ نہایت اہم ہے۔ اس نے تاریخ کو زمان میں ایک مسلسل اجتماعی حرکت قرار دیا اور اس حرکت کو صحیح معنوں میں تخلیقی بتایا۔ یہ حرکت ایسی نہیں۔ جس کی راہ پہلے سے ہی

---

[1] خطبات صفحہ ۱۵۱

متعین ہو۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ اس کا نظریہ اسے فلنٹ کی اس تعریف کا حقدار بنا دیتا ہے کہ افلاطون، ارسطو، اور آگسٹائن اس کے ہم پلہ نہ تھے اور باقی تو اس قابل بھی نہیں۔ کہ ان کا ذکر اس کے ساتھ کیا جائے ؎ یہ درست ہے کہ ایک مسلمان ہی زماں و تاریخ کے متعلق ایسا نظریہ قائم کر سکتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی نظم 'زمانہ' میں ماضی، حال و مستقبل کے اسرار بیان کیے ہیں۔ نئے نئے واقعات کی نمود اور روز و شب کا تصور بیان کیا ہے زمانہ کی زبان سے بیان فرماتے ہیں کہ میری صراحی سے واقعات قطروں کی صورت میں ٹپک رہے ہیں۔ روز و شب میری تسبیح کے دانے ہیں۔ جن کو میں شمار کرتا رہتا ہوں۔ میں ہر ایک سے آشنا ہوں۔ لیکن میری راہ و رسم ہر کسی سے مختلف ہے۔ کسی کا راکب ہوں کسی کا مرکب اور کسی کے لیے عبرت کا تازیانہ میں کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ لیکن جو آدمی عنصر مخالف کی پروا نہ کرے وہ مجھے پا لیتا ہے ؎

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ!
ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ

؎ خطبات صفحہ ۱۸۱

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل، قصور میرا ہے یا کہ تیرا ؟
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ
مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اُس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ!

بال جبریل ۱۸۵

اپنی فارسی نظم "نوائے وقت" میں بھی زمانہ کی تشریح کی ہے اور اُس کے مختلف پہلو بیان کئے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

خورشید بہ دامانم، انجم بہ گریبانم　　در من نگری ہیچم، در خود نگری جانم
در شہر و بیابانم، در کاخ و شبستانم　　من دردم و درمانم، من عیشِ فراوانم
من تیغِ جہاں سوزم، من چشمۂ حیوانم
چنگیزی و تیموری، مشتے ز غبارِ من　　ہنگامہ افرنگی، یک جستہ شرارِ من
انسان و جہانِ او، از نقش و نگارِ من　　خونِ جگرِ مرداں، سامانِ بہارِ من
من آتشِ سوزانم، من روضۂ رضوانم
آسودہ و سیارم، ایں طرفہ تماشا بیں　　در بادۂ امروزم، کیفیتِ فردا بیں
پنہاں بہ ضمیرِ من، صد عالمِ رعنا بیں　　صد کوکبِ غلطاں بیں، صد گنبدِ خضرا بیں
من کسوتِ انسانم، پیراہنِ یزدانم　　پیامِ مشرق ۱۰۲

اس نظم کے آخر میں اُس گہرے تعلق کو ظاہر کیا ہے۔ جو انسان کا

زمانہ یا دوسرے لفظوں میں تقدیر سے ہے۔ زمانہ انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میرا افسوں تقدیر ہے اور تیرا فسوں تدبیر۔ میں دشت جنوں ہوں تو عاشق لیلیٰ، میں تجھی سے پیدا ہوتا ہوں اور تجھ میں پنہاں ہوں۔ میں رہرو تو منزل۔ میں مزرع تو حاصل۔ محفل کی گرمی تیرے دم سے ہے۔ تیرے جام میں میرا قلزم سما سکتا ہے اور تیری موج کے بلند ہونے سے مجھ میں طوفان اُٹھتے ہیں ؎

تقدیر فسونِ من، تدبیر فسونِ تو
تو عاشقِ لیلائے، من دشتِ جنونِ تو
چوں روحِ رواں پاکم، از چند و چگونِ تو
تو رازِ درونِ من، من رازِ درونِ تو
از جانِ تو پیدایم، در جانِ تو پنہانم
من رہرو و تو منزل، من مزرع و تو حاصل
تو سازِ صد آہنگے، تو گرمیِ ایں محفل
آوارۂ آب و گِل، دریاب مقامِ دل
گنجیدہ بہ جامے بیں، ایں قلزمِ بے ساحل
از موجِ بلندِ تو سر بر زدہ طوفانم پیامِ مشرق ۱۰۳

اقبال کے خیال کے مطابق انسان، زمانہ، تقدیر، کائنات اور خدا سب ایک دوسرے سے رشتہ میں ایسے منسلک ہیں کہ ان کے تعلق کو توڑا نہیں جا سکتا اور نہ یہ ممکن ہے کہ انسان اس تعلق کو سمجھے بغیر کامیابی

کے ساتھ زندگی کا سفر طے کرے ۔ جو لوگ وقت کو حقیقت نہیں سمجھتے
قسمت پرستی اور "تقدیر" کے چکر میں پھنس جاتے ہیں اور جو اسے حقیقت تسلیم
کرتے ہیں وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنی تقدیر کی تشکیل کرتے جاتے ہیں۔
زمانہ کے امکان ظاہر کرنے کے لیے انسان کی کوشش اور شخصیت اہم جز
ہے ۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے :۔

وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ ۱۴/۳۴	جو کچھ تم سوال کرتے ہو ۔ تم کو اس نے دیا ۔

یہ بھی فرمایا :۔

وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ۱۱/۱۰۹ ع	اور ہم ان کا حصہ ان کو بلا کم و کاست دینے والے ہیں ۔

اس بڑی حقیقت کو بالکل سادہ لفظوں میں یوں بیان کیا ہے ؎

ترا زمانہ تاثیر تیری ! نادان ! نہیں یہ تاثیرِ افلاک

ضربِ کلیم ۱۱۱

اللہ تعالیٰ ہر شے کو وہی عطا کرتا ہے جو اس کی ماہیت یا عین کا
تقاضا ہوتا ہے[1] یعنی بالِ بازاں سوئے سلطان وبالِ زاغاں سوئے
گورستان ؎

---

[1] محمود شبستری نے اسے یوں بیان کیا ہے ؎

ہر چہ از زین دشین شما است — ز سر مقتضائے عین شما

ہر چہ عین شما تقاضا کرد — جود محض حق آں ہمہ

ہندی۔ اے شریکِ مستیٔ خاصانِ بدر
میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر

رومی۔ بال بازاں را سوئے سلطان برد
بال زاغاں را بگورستان برد

بال جبریل ۱۸۱

اسی لیے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ انسان اپنی قسمت خود بناتا ہے ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے!
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

بال جبریل ۸۱

زمانے کا گلہ وہی کرتے ہیں جو خود قوت و عمل سے محروم ہوتے ہیں ۔
بے حوصلہ کرتا ہے زمانے کا گلہ
بندۂ حُر کے لیے نشتر تقدیر ہے نوش

ضرب کلیم ۱۷۵

ایسے ہی لوگ اپنی قسمت کا اندازہ ستاروں کی گردش سے لگاتے ہیں

وہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

بال جبریل ۴۳

ناموافق تقدیر کو انسان بدل بھی سکتا ہے ۔ اس کے لیے اسے اپنے
مناسب تبدیلی کرنی پڑتی ہے ۔ جب وہ ایسا کر لیتا ہے تو

اُس مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں ہاتھ تو اُس کے ہوتے ہیں لیکن ا
میں طاقت اللہ کی طرف سے کام کر رہی ہوتی ہے:-

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ ۸/۱۷	جب تو نے تیر چلایا تو وہ تو نے نہیں چلایا۔ بلکہ درحقیقت خدا نے چلایا۔

اسی کے مطابق فرمایا ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

بال جبریل ۱۳۲

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

ضرب کلیم ۱۶۷

پھر نہ زمانے کا گلہ رہتا ہے اور نہ شکوۂ جہاں ؎
بخود نگر! گلہ ہائے جہاں چہ می گوئی
اگر نگاہِ تو دیگر شود جہاں دگر است

زبور عجم ۱۳۱

جو انقلاب اسلام اور ایمان کی بدولت حضرت عمرؓ کی خودی میں
ہُوا وہی اس بات کا ذمہ دار تھا کہ دریائے نیل کے نام آپ کا لکھا
دریا میں ڈالا گیا تو اُس کا جوش و خروش اور طوفان ختم ہو گیا۔ یہ حضرت

کہ چار سو بدل جاتا ہے۔ سمندر پایاب ہو جاتے ہیں[1] چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے[2] اور آگ گلزار میں تبدیل ہو جاتی ہے[3]۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایمان پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

بانگ درا ۲۲۸

یہ نظریہ اللہ تعالےٰ کے احکام کو محدود نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ تبدیلی بھی حکم الٰہی سے ہوتی ہے[4] اور اللہ تعالےٰ کے علم میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ ایسی تبدیلی عمل میں لانے کے لیے صرف انسان کا اقدام شرط ہے۔ علامہ اقبال نے اس سلسلہ میں قرآن کریم کی اس آیت کا حوالہ دیا ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۱۳/۱۱	جب تک کوئی قوم اپنی ذاتی صلاحیت کو نہ بدلے۔ خدا اس کی حالت میں کسی طرح کا تغیر نہیں کرتا۔

[1] حضرت موسےٰ کا بحرِ قلزم میں قدم رکھنا اور اس کا پایاب ہو جانا۔

[2] حضورؐ کی انگلی کے اشارہ سے چاند کا دو ٹکڑے ہونا۔

[3] حضرت ابراہیمؑ کا آگ میں پھینکا جانا اور آگ کو حکم۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۙ ۲۱/۶۹	ہم نے کہا اے آگ تو ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم کے حق میں سلامتی کی موجب بن

[4] رسول اللہ سے ایک دفعہ دریافت کیا گیا۔ کہ بیماری میں ہم دوائیں استعمال کرتے ہیں۔ کیا یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے مقررہ تقدیر کو پھیر سکتی ہیں۔ جواب میں فرمایا کہ یہ بھی حق تعالےٰ ہی کی تقدیر سے ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ انسان سبقت کرے۔ تو خدا خود بھی رفیق کار ہو جاتا ہے" انسان کے لیے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ اپنے گرد کی کائنات کی گہری آرزؤں میں شریک ہو اور اس طرح اپنے مقدر اور کائنات کی تقدیر کو بنائے۔ کبھی وہ کائنات کے مطابق اپنے آپ کو بناتا ہے، اور کبھی اُن کو اپنے مقصد کے مطابق ڈھالتا ہے اس عمل میں خدا بھی اس کا شریکِ کار ہوتا ہے۔ اگر انسان کی طرف سے اقدام نہ ہو اور وہ اندرونی وجود کی بے پناہ قوتوں کو بروئے کار نہ لائے اور زندگی کے بڑھتے ہوئے دھارے کا اندرونی زور محسوس نہ کرے تو اُس کی روح پتھر کی مانند ہو جاتی ہے اور وہ بے جان مادہ کی سطح پر اُتر آتا ہے[1] اسی لیے فرمایا ؎

بپائے خود مزن زنجیر تقدیر — تہ ایں گنبدِ گرداں رہے ہست
اگر باور نداری، خیز و دریاب — کہ چوں پا وا کنی جولانگہے ہست

پیام مشرق ۷۹

انسانی زندگی کا مقصد جہاں کو اسیر جان کرنا ہے ؎

حیات چیست؟ جہاں را اسیرِ جاں کردن
تو خود اسیر جہانی، کجا توانی کرد
مقدر است کہ مسجودِ مہر و مہ باشی
ولے ہنوز ندانی چہا توانی کرد

زبورِ عجم

اقبال کا یہ نظریہ انسان کو اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کر کے سے

[1] خطبات صفحہ ۱۳

نہیں کرتا اور نہ ہی اُسے توکل سے مایوس کرتا ہے۔عوف بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے ایک مقدمہ کا فیصلہ فرمایا تو ہارنے والے شخص نے کہا۔حسبی اللہ نعم الوکیل خدا کی مرضی اور میری قسمت۔ حضور نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کم ہمتی کو پسند نہیں فرماتا۔اپنی کوشش اور تدبیر میں کمی نہ کرو اور جب کوشش کے باوجود کوئی کام تمھاری طاقت سے باہر ہو جائے تو پھر یہ لفظ کہو۔

اللہ تعالےٰ نے بھی پہلے عزم کرنے کی ہدایت کی ہے۔عزم سے پہلے تمام حالات و واقعات کا جائزہ لینا ضروری ہے لیکن جب پوری سوچ بچار کے بعد عزم کر لیا جائے تو پھر اللہ تعالےٰ پر اعتماد کرنا مسلمان کا جزو ایمان ہے۔

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ $\frac{۳}{۱۵۸}$	جب عزم کرے تو اللہ پر اعتماد کر تحقیق اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی تھی کہ مصر میں داخل ہوتے وقت اکٹھے نہ جائیں۔بلکہ شہر میں الگ الگ دروازوں سے داخل ہوں۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھیں اللہ پر بھروسہ یا توکل نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے تدبیر بھی کر لی تھی۔ تدبیر اور مشیت دونوں ایک ساتھ ہیں:۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا	آپ نے انہیں کہا۔اے میرے

مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَ مَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَ عَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝

$\frac{12}{67}$

بیٹو دیکھو جب مصر پہنچو تو شہر کے ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا۔ جُدا جُدا دروازوں سے داخل ہونا۔ میں تمہیں کسی ایسی بات سے نہیں بچا سکتا۔ جو اللہ کے حکم سے ہونے والی ہو۔ لیکن تدبیر میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیئے) فرمانروائی اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ میں نے اُسی پر بھروسہ کیا اور وہی ہے جس پر تمام بھروسہ کرنے والوں کا بھروسہ ہے۔

رسول اکرم نے اسی بنا پر سادہ لوح عرب کو جس نے اونٹ کو توکل پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ مشورہ دیا ؎

گفت پیغمبر بآواز بلند ؎ بر توکل زانوے اشتر بہ بند

مومن عزم اور توکل[1] سے ہی قاہر و سربلند بنتا ہے ؎

مومن از عزم و توکل قاہر است ؎ گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

پس چہ باید کرد ۶

---

[1] مولانا روم لکھتے ہیں کہ توکل میں جد و کسب اولیٰ تر ہے ؎

رمز الکاسب حبیب اللہ شنو ؎ از توکل در سبب کاہل مشو

در توکل جد و کسب اولیٰ تر است ؎ تا حبیب حق شوی ایں بہتر است

مومن جو تقدیر کا یہ نظریہ رکھتے ہیں۔ قرآن کریم کی زبان میں
حزب اللہ کا لقب پانے کے مستحق ہیں :-

أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ٥٨/٢٢ | یہ خدائی گروہ ہے اور وہی آخر کار فلاح پائے گا۔

وہ کبھی نومیدی کو نزدیک نہیں آنے دیتے ؎

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں! بالِ جبریل ۱۶۲

یہ اُمید استقلال و استقامت بخشتی ہے اور قلبِ انسانی میں
تسکین و طمانیت پیدا ہوتی ہے اس سے مخالفین پر خوف و رعب
طاری ہوتا ہے۔ یہاں ایمان تعداد کا محتاج نہیں رہتا اس کے ثبوت
میں تاریخ اسلام کے بے شمار واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں یہ ایمان
کی ہی قوت تھی جس سے سرشار ہو کر جنگ بدر میں ۳۱۳ مسلمان ایک
ہزار مخالفین پر، جنگ اُحد میں .. ، مسلمان تین ہزار پر۔ جنگ خندق میں
تین ہزار مومن دس ہزار پر۔ فتح خیبر کے وقت چودہ سو مسلمان تیس ہزار
پر۔ جنگ قادسیہ میں چھتیس ہزار مسلمان ایک لاکھ ایرانیوں پر اور جنگ
یرموک میں چالیس ہزار فرزندانِ توحید دو لاکھ چالیس ہزار عیسائیوں
پر غالب آئے۔

لیکن یہ کام اُن پختہ کار مردانِ خدا کا ہے۔ جو کسی رکاوٹ کو خاطر
میں نہیں لاتے اور ہر قسم کے حالات میں اپنے موافق نئی دنیا پیدا

کر لیتے ہیں ؎

خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو ۔ شعلہ در برکن خلیلؑ آوازہ شو

با جہانِ نامساعد ساختن ۔ ہست در میداں سپر انداختن

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار ۔ با مزاجِ او بسازد روزگار

گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں ۔ می شود جنگ آزما با آسماں

می کند از قوتِ خود آشکار ۔ روزگارِ نو کہ باشد سازگار

اسرار ۵۸

یہ انسان کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر خود تقدیر یزداں بنے یا بے حس ہوکر تقدیر کے لکھے کا انتظار کرے اور لاش کی مانند زمانہ کی پیٹھ کا بوجھ بنا رہے۔ مریدِ ہندی اپنے پیر سے تسخیرِ آب و گل کا طریق دریافت کرتا ہے۔ پیرِ رومی اُسے ایسا ہی جواب دیتا ہے ؎

مریدِ ہندی ۔ کس طرح قابو میں آئے آب و گل؟
کس طرح بیدار ہو سینے میں دل؟

پیرِ رومی ۔ بندہ باش و بر زمیں رو چوں سمند
چوں جنازہ نے کہ بر گردن برند ۔ بالِ جبریل ۱۸۶

ناموافق تقدیر کو ہمارے نئے عمل کا محرک ہونا چاہیئے اور حق تعالٰے سے موافق تقدیر کا طالب ؎

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر ۔ خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر

تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست　　　زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست

جاوید نامہ ۱۲۳

انسان اگر شبنم کی مانند زندگی بسر کرے تو اُس کی تقدیر بھی اسی کے موافق ہوگی۔ لیکن جب سمندر کی طرح بے پایاں ہو جائے تو دوام حاصل کر لیتا ہے ؎

ارضیاں نقدِ خودی در باختند　　　نکتۂ تقدیر را نشناختند

رمزِ باریکش بحرفے مضمر است　　　تو اگر دیگر شوی او دیگر است!

خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا　　　سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا

شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست

قلزمی؟ پایندگی تقدیر تست

جاوید نامہ ۱۲۳

تقدیر انسانی فکر کے ساتھ بدل جاتی ہے ؎

عالمِ افکار تو زندانِ تست

رنج بے گنج است، تقدیر این چنین

گنج بے رنج است، تقدیر این چنین

جاوید نامہ ۱۲۳

ہر چیز کی قیمت انسان کے اندازِ نگہ پر دار و مدار رکھتی ہے ؎

تا متاعِ تست گوہر گوہر است　　　ورنہ سنگ است از کشیزے کمتر است

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود　　　ایں زمین و آسمان دیگر شود

جاوید نامہ ۱۲۶

مسئلہ جبر و اختیار پر کافی بحث ہو چکی ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر ہم اُسے ایک اور مثال سے ظاہر کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں حضرت آدم اور شیطان ہر دو سے گناہ سرزد ہونے کا ذکر ہے۔ لیکن گناہ کے متعلق جو رویہ آدمؑ نے اختیار کیا وہ شیطان سے بالکل مختلف ہے۔ حضرت آدم سے گناہ سرزد ہوا تو انھوں نے کہا:۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ ۷/۲۳	وہ کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو معاف نہیں فرمائے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم بالکل برباد ہو جائیں گے۔

لیکن شیطان سے گناہ سرزد ہوا تو اس نے کہا:۔

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ۔ ۷/۱۶-۱۷	(شیطان) کہنے لگا کہ جیسے تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں بھی تیرے سیدھے رستہ پر بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں گا۔ پھر ان کے پاس آؤں گا۔ آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کی داہنی طرف سے اور بائیں طرف سے اور تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والے نہیں پائے گا۔

فرق عیاں ہے۔ آدم نے گناہ کی ذمہ داری خود قبول کی اور اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ اللہ تعالےٰ نے اُسے نیکی و بدی کی راہ منتخب کرنے کا اختیار دیا تھا۔ لیکن شیطان نے اپنے گناہ کا ذمہ دار خدا کو گردانا۔ اقبال نے اس واقعہ کو ابلیس اور خدا کے مکالمہ کی صورت میں بیان کیا ہے۔ ابلیس کہتا ہے کہ میں نے آدم کو سجدہ اس لیے نہ کیا کہ مشیّت ایزدی کو اسی طرح منظور تھا ؎

ابلیس۔ اے خدائے کُن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ! وہ زندانیٔ نزدیک و دُور و دیر و زود
حرفِ 'استکبار' تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود

اس کے جواب میں اللہ تعالےٰ فرشتوں کو یوں خطاب کرتا ہے ؎

یزداں، پستی فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجّت اسے
کہتا ہے 'تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود'
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

ضربِ کلیم ۴۳

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ شیطان نے خدا سے کہا کہ میں اولادِ آدم کو سیدھے رستہ سے بھٹکاتا رہوں گا۔ شیطان کے اس عزم سے نیکی و بدی اور خیر و شر کی کشمکش زیادہ نمایاں ہوگئی اور یہ بے کیف عالم

جہانِ سوز و ساز میں تبدیل ہو گیا۔ اقبال کے خیال میں شیطان کا وجود ہماری جدوجہد میں رکاوٹ پیدا کر کے ہماری خودی کو اور زیادہ مضبوط اور مکمل کرنے کا باعث ہے۔ یہ کشمکش انسان کے جوہرِ خودی کو مستحکم کر دیتی ہے اور انسانیت کے فروغ و ارتقا کا موجب بنتی ہے جسے کوئی مخالف قوت فنا نہیں کر سکتی اور اس مقابلہ میں کامیابی سے وہ بادشاہت حاصل ہوتی ہے۔ جسے زوال نہیں :۔

مُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ ۲۰/۱۲۰ | بادشاہی جو پرانی نہ ہو۔

مردِ مومن کی شان ہی یہ ہے کہ وہ تمام تکلیفوں اور رکاوٹوں کے باوجود راہِ حق پر جما رہتا ہے۔ مخالف عناصر کو زیر کرنے میں انسان کو اپنی اندرونی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لانے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو پیدا ہوتا ہے۔ ابلیس جبریل کو مخاطب کر کے کہتا ہے ؎

ہے میری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو!

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگین کر گیا کس کا لہو؟

بال جبریل ۱۹۴

اپنی نظم تسخیرِ فطرت میں انکار ابلیس پر اُسی کی زبان سے رگِ کائنات میں سوز و ساز کا قصہ یوں بیان کیا ہے ؎

می تپد از سوزِ من، خونِ رگِ کائنات
من بہ دو صرصرم، من بہ غوِ تندرم
رابطۂ سالمات، ضابطۂ اُمہات
سوزم و سازے دہم، آتشِ مینا گرم
ساختۂ خویش را، در شکنم ریزہ ریزہ
تا ز غبارِ کہن، پیکرِ نو آورم
از دمِ من موجۂ چرخِ سکوں ناپذیر
نقش گرِ روزگار، تاب و تب جوہرم
پیکرِ انجم ز تو، گردشِ انجم ز من
جاں بجہاں اندرم، زندگیٔ مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی، شور بجاں من دہم
تو بہ سکوں رہ زنی، من بہ تپش رہبرم
من ز تنک مایگاں گریہ نکردم سجود
قاہرِ بے دوزخم، داورِ بے محشرم

آدمِ خاکی نہاد، دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوشِ تو پیر شود در برم

پیام مشرق ۹۸

اِس لحاظ سے شیطان کا وجود انسان کے لیے منفعت لانے والا ہے نہ کہ اُس کی قوتوں کو مختل کرنے والا۔ اقبال کے نزدیک بقائے شخصی اور اور زندگی کے علو و ارتقا کے لیے تصادم (سیاسی حیثیت سے نہیں بلکہ اخلاقی حیثیت سے) نہایت ضروری ہے" وہ ابلیس کی قاہرانہ قوت اور ایمان محکم کی طاقت کا مقابلہ چاہتے ہیں۔ تاکہ ایمان کی روشنی اُس ظلمت کو دُور کر کے اجالا کر دے۔ وہ ایسے فرماں پذیر سے سخت متنفر ہیں۔ جو خود دوڑ کر ابلیس کے جال میں جا پھنسے۔ بلکہ ابلیس خود اللہ تعالےٰ سے شکایت کرتا ہے کہ میں اس اطاعت کیش آدم سے بیزار ہوں۔ جس کے ضعف نے میری قوت کو زنگ لگا دیا ہے ؎

اے خداوندِ صواب و ناصواب — من شدم از صحبتِ آدم خراب
صید خود صیاد را گوید بگیر — الاماں از بندۂ فرماں پذیر!
از چنیں صیدے مرا آزاد کن — طاعتِ دیروزۂ من یاد کن

پست از وآں ہمتِ والائے من
وائے من اے وائے من اے وائے من

جاوید نامہ ۱۶۰

وہ اپنی آتش نفس کی فراوانی پر افسوس کرتا ہے کہ صرف خس و خاشاک کو جلانے کے لیے اس قدر گرمی کی کیا ضرورت تھی ؎

ابنِ آدم چیست؟ یک مشتِ خس است
مشتِ خس را یک شرار از من بس است
اندریں عالم اگر جز خس نبود
ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود؟
شیشہ را بگداختن عارے بود
سنگ را بگداختن کارے بود جاوید نامہ ۱۶۱

قانونِ ارتقا کی رو سے بھی وہ انواع ترقی نہیں کرتیں جنھیں ناساعد حالات سے واسطہ نہیں پڑتا۔ وہ ہماری جمود و تعطل کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ جس کے رستہ میں چٹانیں اور پتھر حائل نہ ہوں۔ انسانی خودی اگر اپنے غیر سے متصادم نہ ہو تو یہ جہانِ رنگ و بو بالکل بے کیف ہو جائے اور کائنات کا تمام ہنگامہ سرد پڑ جائے ؎

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او
غیر او پیداست از اثباتِ او
سازد از خود پیکرِ اغیار را
تا فزاید لذتِ پیکار را
اسرار ۱۲

علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ میرے عقیدے میں حقیقت ایک

کا مجموعہ ہے جو تصادم کے واسطے سے ربط و امتزاج پیدا کر کے کُل کی صورت میں تبدیلی کی سعی کر رہے ہیں اور یہ تصادم لا محالہ اُن کی شیرازہ بندی اور ارتباط پر منتج ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں عمل کی تمام صور و اشکال مختلفہ کو جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے ضروری سمجھتا ہوں۔ اور میرے نزدیک اُن سے انسان کو زیادہ استحکام و استقلال حاصل ہوتا ہے"[1]

ابلیس کو شکست دینا مردِ مومن کا کام ہے۔ اس کے لیے ایسے صاحبِ نظر درکار ہیں جو ایمان و اعمال صالح سے اپنی خودی کو مضبوط بنائیں اور جو ابلیس کو ایسا جھنجوڑ سکیں کہ اُس کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ ابلیس کسی ایسے مردِ حق پرست کو ملنے کی التجا کرتا ہے۔ جو اُس کی گردن مروڑ سکے ؎

منکرِ خود از تو می خواہم بدہ — سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
بندۂ باید کہ پیچد گردنم! — لرزہ اندازد نگاہش در تنم
اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست — جاوید نامہ ۱۶۱

اسلام زندگی کے حقائق سے روشناس ہونا سکھاتا ہے یہاں فرار کی وہ تمام راہیں بند ہیں۔ جو بدھ مت یا عیسائیت وغیرہ نے پیدا کر رکھی تھیں۔ زندگی کی کشمکش حقیقی ہے اور اسی لیے روز ازل سے جاری ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی — بانگِ درا ۲۲۹

---

[1] ۔۔۔ نکلسن کے نام علامہ اقبال کا خط۔

یہ کشمکش اسی طرح جاری رہے گی۔ ابلیس کو ہلاک نہیں کیا جا سکتا۔ اُسے اللہ تعالےٰ کی طرف سے قیامت تک کے لیے مہلت مل چکی ہے مومن کا کام یہ ہے کہ وہ اُسے کشتۂ شمشیرِ قرآن کر کے مسلمان کرے ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است!
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

جاوید نامہ ۸۳

ابلیس کو تابع فرمان رکھنے کے لیے قوانین الٰہیہ پر عمل ضروری ہے۔ سکون و جمود پیدا کرنے والا ہر فلسفہ اس راہ میں سنگ گراں ہے اسلامی دنیا میں تقدیر کا وہ نظریہ جسے عام فہم زبان میں 'قسمت' کے لفظ سے پکارا جاتا ہے اور جس کے متعلق اوپر بحث کی گئی ہے۔ عمل و فعل کو مختل کر کے نہایت تباہ کن اثرات کا موجب بنا ہے ؎

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

ارمغانِ حجاز ۲۷۲

جمود کو مسلط کرنے والا یہ نظریہ کئی ایک اسباب کا رہین منت ہے۔ یہ کسی حد تک تو اُن روح پرور و زندگی بخش اثرات کی کمی کی وجہ سے رونما ہوا۔ جو حقیقی اسلامی تعلیم کی طرف سے غفلت برتنے پر مسلمانوں میں آہستہ آہستہ پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ مفکرین کے خیالات کی رو اور کئی ایک سیاسی امور بھی اس کے پھیلانے میں برابر کے شریک ہوئے سیاسی میدان

میں دمشق کے بنو امیہ خاندان کے وہ فرمانروا جو مادی فوائد کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ کافی حد تک اس فلسفہ کی ترقی کے موجب ہوئے۔ بنی امیہ کا اہل بیت کے ساتھ برتاؤ تمام دنیا کو معلوم ہے۔ چنانچہ وہ عوام کی کسی ممکن بغاوت یا بد دلی کو روکنے کے لیے حادثۂ کربلا کا جواز مشیت الٰہیہ میں تلاش کرنے لگے اور تقدیر کے اُس فلسفہ کو ترقی دی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اُس زمانہ کے مسلمان صوفیا نے اس خیال کے مضر اثرات کو سمجھتے ہوئے اس کے خلاف آواز بلند کی لیکن سیاسی ہنگامہ آرائی میں قومی قوتوں کو مفلوج کرنے والا غیر اسلامی فلسفہ آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا۔ اپنے وقت میں اقبال نے اس کے خلاف پیہم اور زبردست احتجاج کیا اور قوم کو اسلامی روایات، اسلامی تمدن، اور قرآنی فلسفہ سے روشناس کرا کر اپنی تقدیر کا مالک بننے پر کتنی زوردار الفاظ میں اکسایا ہے۔

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں!
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟

ارمغان حجاز ۲۵۴

لہ حضرت حسن بصری سے پوچھا گیا کہ بنو اُمیّہ نے مسلمانوں کو خود قتل کیا لیکن اپنے افعال کو خدا تعالےٰ کی طرف منسوب کر کے کہا کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ایسے لوگ خدا کے دشمن اور جھوٹے ہیں۔ خطبات صفحہ ۱۱۰

اپنی تقدیر کو بدلنے یا خود تقدیر یزداں بننے کے لیے خاص ذرائع اختیار کرنے ضروری ہیں۔ جن میں واضح اور معین مدعا کا پیشِ نظر رکھنا اور آرزو و جستجو کو ہمیشہ اپنا شعار بنائے رکھنا سب سے ضروری ہے۔ اپنے مدعا کو سامنے رکھ کر انسان اس کی روشنی میں بڑھتا ہوا چلا جاتا ہے

زندگانی را بقا از مدعا ست — کاروانش را درا از مدعا ست

زندگی در جستجو پوشیده است — اصل او در آرزو پوشیده است

اسرار ۱۲

حیات بے مقصد نہیں ہے اور نہ ہی اللہ تعالےٰ نے اس کائنات کو بے معنی پیدا کیا :-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۔ ۴۴/۳۸

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ کھیل کے طور پر نہیں پیدا کیا۔

مقصدِ حیات کا اعلےٰ و ارفع ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ انسان کا عروج اس مقصد کی بلندی کے ساتھ گہری نسبت رکھتا ہے۔ بال جبریل میں علامہ نے چیونٹی اور عقاب کا مکالمہ درج کیا ہے۔ چیونٹی عقاب سے سوال کرتی ہے ؎

میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند؟

عقاب جواب دیتا ہے ؎

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں!
میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

بالِ جبریل ۲۲۴

اس امر کی تصدیق کہ ماحول و ضرورت کے مطابق جسمانی ساخت میں تبدیلی ہو سکتی ہے ہمیں علم الحیات سے ملتی ہے۔ انسان کی لذتِ دیدار کبک کی رفتار اور بلبل کی نوا یعنی مقصد و آرزو کے حصول کی طرف رہنمائی کرتے ہیں ؎

چیست اصل دیدۂ بیدارِ ما؟ بست صورت لذتِ دیدارِ ما
کبک پا از شوخیٔ رفتار یافت بلبل از سعیِ نوا منقار یافت

اسرار ۱۷

اگر انسان اپنے اعلیٰ مقاصد سے نیچے اُتر آئے تو نتیجہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے ؎

سنگ چوں بر خود گمان شیشہ کرد شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد

فولاد اپنی سختی چھوڑ دے تو اس کی شمشیر کیونکر بنے ؎

فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق پیدا ہو اگر اس کی طبیعت میں حریری!

ضربِ کلیم ۱۷۸

ہلاکت و بربادی اتفاقیہ نہیں ہوتی۔ اللہ تعالےٰ کا قانون یہ ہے کہ ہلاکت و تباہی سے پہلے اتمام حجت ضرور ہوتی ہے:-

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ | تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے۔ اتمام حجت کے

عَنْ بَیِّنَۃٍ وَّ یَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْ بَیِّنَۃٍ ؕ	بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلائل و براہین کے ساتھ زندہ رہے۔

۸/۴۲

انسان اپنے مقصد حیات سے خود غافل ہو جائے۔ تو اس کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنی کمزوری یا ضعف خودی کو "قسمت" کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرے۔ قوموں کی تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت جلدی نمایاں ہو جاتی ہے کہ تقدیر کا لکھا ہمیشہ اعمال کے نتائج کی صورت میں ہی سامنے آتا ہے۔

تکمیل خودی کا مدعا سامنے رکھ کر آرزو و جستجو کی مدد سے انسان اپنے ان اعلےٰ ترین مقاصد کے حصول کی امید رکھ سکتا ہے۔ جن کے لیے قدرت نے اُسے پیدا کیا ہے۔ اس کے لیے امید ضروری ہے۔ یاس اور نامیدی ابلیس کا کام ہے۔ وہ انتہائی مایوسی کا مظہر ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔

وَلَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ ۔ ۱۲/۸۷	اللہ تعالےٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ تحقیق اللہ تعالےٰ کی رحمت سے کافروں کی قوم کے علاوہ کوئی ناامید نہیں ہوتا۔

مسلمان کا ایمان یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی حالت میں بھی ذلت پر آمادہ ہو جائے۔ وہ ہمیشہ شراب مقاصد سے سرشار ہو کر باطل کے لیے

تلوار بنا رہتا ہے ؎

مقصدے مثلِ سحر تابندۂ ماسوے را آتش سوزندۂ
مقصدے از آسمان بالا ترے دلربائے دلستانے دلبرے
باطلِ دیرینہ را غارتگرے
فتنہ در جیبے سراپا محشرے اسرار ۱۸

مغربی حکماء میں شوپنہار یاس و قنوط کے فلسفہ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اُس کا فلسفہ اِس بات کا نتیجہ ہے کہ مشیت کی قوتِ تخلیق ایک اندھا ارادہ ہے۔ جس میں شعور یا بصیرت موجود نہیں۔ اُس کی نظر میں انسانی ہستی کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور آخر کار موت اُسے اس سے نجات دلاتی ہے۔

زندگی میں تصادم کو دیکھ کر اُس نے اِسے شر قرار دیا اور "خواہش زلیست" کو تمام برائیوں کی بنیاد سمجھا۔ نطشے نے جب "خواہش اقتدار" کو بنیادی حقیقت کہا شوپنہار نے اُسے بُرا بتایا۔ یا یوں کہئے شوپن ہار نے جسے شیطان قرار دیا نطشے نے اُسے خدا سمجھا۔ اقبال ان دونوں سے جدا رستہ پر ہے۔ اُس کا نظریہ حیات "تکمیلِ خودی" ہے جس میں رنج و غم اور تصادم و رکاوٹ کی بھی ایسی ہی اہمیت ہے۔ جتنی خود زلیست کی۔ ان سے انسانی سیرت میں پختگی خودی میں بلندی اور فطرت کو کمال حاصل ہوتا ہے

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی
ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں
حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لیے گردِ ملال
طائرِ دل کے لیے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے
غم نہیں غم، روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے
جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا
ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے
عشق جس کا بےخبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

بانگِ درا ۱۶۸

غم اور تصادم سے مسلمان مایوس نہیں ہو جاتا۔ یاس قنوط اُس کے نزدیک نہیں آسکتے علامہ نے اپنی نظم "شوپن ہار اور نیٹشا" میں بھی تعلیم دی

ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مرغے ز آشیانہ بسیر چمن پرید — خارے زشاخ گل بہ تن نازکش خلید

بد گفت فطرتِ چمن روزگار را — از دردِ خویش و ہم زغم دیگراں تپید

داغے زخونِ بیگنہے لالہ را شمرد — اندر طلسم غنچہ فریب بہار دید

گفت اندریں سرا کہ بنایش فتادہ کج — صبحے کجا کہ چرخ درو شامہا نہ چید

نالید تا بجو صلۂ آں نوا طراز — خوں گشت نغمہ وز دو چشمش فرو چکید

سوز فغانِ او بدلِ ہدہدے گرفت — با نوکِ خویش خار ز اندامِ او کشید

گفتش کہ سود خویش زجیب زیاں برآر — گل از شکافِ سینہ زرِ ناب آفرید

درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
خو گر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

پیام مشرق ۲۳۴

ہندوستان میں بدھ کا فلسفہ شوپنہار سے ملتا جلتا ہے۔ حقیقت میں "آریائی خاندان کی مختلف شاخوں کی جدوجہد کے نتائج میں ایک حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے۔ تمام تصوری فلسفے کا نتیجہ ہندوستان میں بدھ، ایران میں بہاء اللہ، اور مغرب میں شوپن ہار ہے۔ جن کا نظام فلسفہ ہیگل کی زبان میں آزاد مشرقی کلیت اور مغربی جبریت کا امتزاج ہے" [1]

مہاتما بدھ نے انسان کے لیے بہترین تجویز یہ قرار دی کہ وہ اس دنیا کے پاپ سے جتنا جلدی ممکن ہو چھٹکارا حاصل کرے۔ چنانچہ مہاتما

[1] فلسفہ عجم صفحہ ۱۶

کے پیرو بھکشو بن کر جنگلوں میں پھرنے لگے اور دنیا سے قطع تعلق کر لیا۔ اس قسم کا فلسفۂ زندگی کو دین و دنیا کے دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دینے کا نتیجہ تھا۔ دنیا کا مطلب سربلندی و خوشحالی اور دین کا مقصد کمزوری و بے چارگی کو لیا گیا۔ دنیا کی ہر نعمت اور فراوانی دنیا دار کے لیے مخصوص ہوئی۔ دین سے تعلق رکھنے والے انسانوں کے لیے فاقہ کشی اور ترک دنیا منتہائے نظر قرار پایا۔ اس طرح کمزوری و محتاجی باعث عزت و فخر ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے دور لے جانے والے فلسفہ میں زینو کا نظریہ اور اپی کیورس کا فلسفہ بھی شامل ہیں۔ انھوں نے غریبوں کو صبر کی تلقین کی اور سادہ زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی۔ اس طرح کا فلسفہ مجبور لوگوں کو مستقل پستی میں رکھنے کے ذرائع مہیا کرنے کا موجب ہوا۔

اسلام نے اس قسم کے تمام نظریوں کو غلط قرار دیا۔ دین و دنیا کی تفریق کو نامناسب سمجھا اور دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کو بھی دین کا جزو سمجھا۔ کمزوری و محتاجی کو اعلیٰ اخلاق کا جزو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور امید و آرزو کو زندگی کا راز قرار دیا اور انسان کی مشتِ خاک کو مزار بننے سے روکا۔

آرزو را در دلِ خود زندہ دار	تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست	فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست

Cynicism and Stoicsm.

طاقتِ پرواز بخشد خاک را	خضر باشد موسیٰ ادراک را
آرزو صیادِ مقاصد را کمند	دفترِ افعال را شیرازہ بند

اسرار ۱۶

بلند مقصد و آرزو سے انسان ترقی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو معالی امور (عالی حوصلگی کے بڑے کام) پسند ہیں اور محقرات امور (چھوٹی اور دنی باتیں) ناپسند ہیں۔ ایک حدیث میں معلمِ اسلام نے یہی تعلیم دی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ معالى الامور	بے شک اللہ معالی امور کو پسند اور محقرات
وَيبغض سفسافها	امور کو ناپسند کرتا ہے[1]

شاعرِ مشرق نے اسی لیے شرر سے ستارہ اور ستارہ سے آفتاب کی جستجو کا ذکر کیا ہے ؎

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایت آں کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امید وارے

[1] سیرۃ النبی جلد ششم صفحہ ۹۹	پیامِ مشرق ۱۹۱

اقبال اس کیڑے کی طرح نہیں رہنا چاہتا۔ جو پتے پر بیٹھا رہے
[illegible] انگور سے بے خبر ہو۔ وہ ہر لمحہ نئی جولانگاہ کا طالب ہے ؎

[illegible] ازداں یک تازہ جولانگاہ می خواہم ازو
تا جنوں فرمائے من گوید دگر ویرانہ نیست

کارواں فریب خوردۂ منزل ہو کر نشاطِ رحیل کو چھوڑ دیتا ہے ؎

[illegible] فریب خوردۂ منزل ہے کارواں ورنہ
زیادہ راحتِ منزل سے ہے نشاطِ رحیل

بالِ جبریل ۹۲

اپنے مخصوص انداز میں علامہ مرحوم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر لیلےٰ
[illegible] نشیں ہو۔ تو بہتر یہ ہے کہ محمل بھی قبول نہ کیا جائے ؎

[illegible] رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
[illegible] اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

ضربِ کلیم ۱۷

[illegible] وجہ بیان کی ہے ؎

[illegible] ما ز سوزِ ناتمام است چو ماہی جز تپش بر ما حرام است
[illegible] ساحل کہ در آغوشِ ساحل تپیدن یک دم و مرگ دوام است

پیامِ مشرق ۶۹

فراق سے آرزو میں گرمی اور زندگی میں حرکت قائم رہتی ہے

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق

وصل میں مرگِ آرزو! ہجر میں لذتِ طلب!

گرمیٔ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہُو فراق

موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق

بالِ جبریل ۱۵۶

انسان کے تب و تاب اور سوز و ساز سے جبریل بھی واقف ہو کر وصالِ جاوداں کو چھوڑنے پر تیار ہو جاتا ہے ؎

"گذشتم از وصالِ جاودانے کہ بینم لذتِ آہ و فغانے

مرا ناز و نیازِ آدمے دہ! بجانِ من گدازِ آدمے دہ"

زبورِ عجم ۲۰۶

آرزو جب ختم ہو جائے تو حقیقت میں وہی موت ہے قطعِ آرزو زندگی کے لیے سمِ قاتل ہے ؎

مرگ را سامان ز قطعِ آرزو ست

زندگانی محکم از لا تقنطوا ست

تا امید از آرزوئے پیہم است

نا امیدی زندگانی را سم است

رموز ۱۰۸

منزل پر پہنچ کر بیکار ہو جانے سے جادۂ پیچیدہ کا سفر قائم رکھنا

عبد رجا بہتر ہے ؎

خیال او درونِ دیدہ خوشتر — غمش افزودہ جاں کاہیدہ خوشتر
مرا صاحبدلے ایں نکتہ آموخت — ز منزل جادہ پیچیدہ خوشتر

پیام مشرق ۸۷

مسلمان کا کام بڑھنا اور ترقی کرنا ہے۔ علامہ اقبال کے خیال میں مسلمانوں نے ہلال کا نشان اسی لیے شروع کیا کہ اس میں ہر روز بڑھنے کا اشارہ ہے۔ ہلال کا لفظ ہی نمو کا اشارہ کرتا ہے [1]

اپنے مدعا کے حصول اور آرزو و جستجو کی تڑپ کو صحیح طور پر بروئے کار لانے کے لیے عمل کی ضرورت ہے۔ بے عمل انسان میں وہ قوتیں بیدار نہیں ہو سکتیں۔ جو انسان کو تکمیلِ خودی یا استقرارِ ذات کے درجہ تک پہنچاتی ہیں۔ اس کے متعلق حق تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۙ

۶۷
۲

بڑا ہی برکت ہے وہ (خدائے با اختیار) جس کے ہاتھ میں (دنیا جہان کی) سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم لوگوں کو آزمائے کہ تم میں کون اچھے عمل کرنے والا ہے اور وہ غالب بخشنے والا ہے۔

[1] غازی عبدالرحمٰن کے نام علامہ اقبال کا خط - اقبال نامہ صفحہ ۲۳۷

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے زندگی کے عملی پہلو پر بہت زور دیا ہے[1]۔ اس تعلیم کے مطابق موت اور زندگی کا یہ سلسلہ اللہ تعالےٰ نے اسی غرض کے لیے بنایا کہ وہ بندوں کا امتحان کرے اور دیکھے کہ کون اچھے عمل کرتا ہے اور کون کمزوری اعمال کی وجہ سے ناکام اور نامراد رہتا ہے۔

صرف زبانی آمنّا کہنا کافی نہیں۔ بلکہ عملی لحاظ سے آزمائش شرط ہے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۔ ۲۹/۲	کیا لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ صرف آمنّا کہنے پر چھوڑ دئے جائیں گے اور آزمائے نہیں جائیں گے۔

خدا کے نزدیک یہ بہت بڑی برائی ہے کہ ہم زبان سے تو کہیں مگر اس پر عمل نہ کریں۔

کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۶۱/۳	یہ بات اللہ کو سخت ناپسند ہے کہ کچھ کہو اور عمل نہ کرو۔

یہ دُنیا لازمی طور پر دار العمل ہے اور اخلاص عمل کے بغیر فلاح ناممکن ہے اس کے متعلق تاریخ اسلام میں حضرت عمرؓ کا فرمان موجود ہے جو

---

[1] مولانا اشرف علی تھانوی نے قرآن کریم کی ایک سو آیات کا انتخاب کیا ہے۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعمال و افعال ہی انسان کو اللہ تعالےٰ کے انعام یا غضب کا مستحق بناتے ہیں۔ اس کے لیے حیٰوۃ المسلمین کا مطالعہ کریں۔

آپ نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کو بھیجا جب وہ ایک ماہ تک مصر کا محاصرہ کرنے کے باوجود کامیاب نہ ہوئے آپ نے تحریر فرمایا کہ "معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مصر و قاہرہ کے مال و دولت کی طمع تمہارے دل میں پیدا ہو گئی ہے اور اخلاصِ عمل میں کمی ہو گئی ہے۔ یہی بات فتح میں رکاوٹ ڈال رہی ہے جمعہ کے روز بعد از نماز توبہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے فتح یابی کی دعا مانگ کر حملہ کر دو۔" چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور کامیاب ہوئے۔

تقدیر کے راز عمل سے کھلتے ہیں اور عمل سے خودی کی صحیح تعبیر ہوتی ہے ؎

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز!
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

بال جبریل ۲۰۱

عمل و کردار سے انسان عالمِ طبیعی کی تسخیر کرتا ہے۔ اور اس طرح نظامِ قرآنی کو رائج کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۹۴/۷	اے پیغمبرِ اسلام، تمہیں فراغت ہو تو محنت کیا کرو۔

اس سعی و عمل اور محنت کا مقصود اللہ تعالٰے کی طرف توجہ یعنی نظام قرآنی و احکام الٰہیہ کی پیروی کو قرار دیا:۔

وَ اِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کرو۔
۹۴/۸

بے عمل آدمی کا سجدہ بھی بے ذوق ہوتا ہے ؎

سجدہ بے ذوقِ عمل خشک و بجائے نرسد
زندگانی ہمہ کردار چہ زیبا و چہ زشت!
پیشِ آئینِ مکافاتِ عمل سجدہ گزار
زانکہ خیزد ز عمل دوزخ و اعراف و بہشت
جاوید نامہ ۲۰۰

عمل کے بغیر زندگی بے معنی ہے۔ ندی اُس وقت تک ندی ہے جب تک رواں ہو۔ موج حرکت میں ہو تو موج ہے ورنہ نہیں ؎

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم!
موجِ ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میروم گر نروم نیستم
پیام مشرق ۱۵۰

یہی حال انسان کا ہے ؎

چہ پُرسی از کجایم چیستم من!   بخود پیچیدہ ام تا زیستم من

دریں دریا چو موجِ بے قرارم اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

پیامِ مشرق ۵۵

انسانی زندگی کا کوئی لمحہ عمل سے خالی نہیں ہونا چاہیے ؎

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را

یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

طبع بلند دادۂ، بند زپائے من کشائے

تا بہ پلاسِ تو دہم خلعتِ شہریار را

زبورِ عجم ۴۲

پیہم عمل کی ضرورت کو علامہ اقبال نے اپنی نظم خضرِ راہ میں بیان کیا ہے۔ ایک پُر سکون رات کو شاعر کی ملاقات خضر سے ہوتی ہے۔ تو وہ پوچھتا ہے ؎

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد !

زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

زندگی کا راز کیا ہے ؟ سلطنت کیا چیز ہے ؟

اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش

خضر کا جواب پیہم عمل کا پیغام ہے ؎

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے

یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

ہفتہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی

ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

بانگ درا ۲۹۱

اسرارِ خودی میں علّامہ مرحوم نے پیہم محنت وسعی کی مثال میں اونٹ کو پیش کیا ہے جو کم خور وکم خواب ہے اور منزل کی طرف سوار سے بھی زیادہ صبر کے ساتھ اپنی رفتار میں مست، قدم بڑھائے چلا جاتا ہے

خدمت ومحنت شعارِ اشتر است — صبر و استقلال کارِ اشتر است

نقشِ پالیش قسمتِ ہر بیشۂ — کم خور وکم خواب و محنت پیشۂ

مست زیر بارِ محمل می رود پا — پائے کوباں سوئے منزل می رود

سرخود از کیفیتِ رفتار خویش

در سفر صابر تر از اسوارِ خویش — اسرار ۷۵

پیہم عمل کی اس تعلیم کے بر عکس مشرقی تہذیب کے فارسی ادب میں بہت عرصہ تک کردار کی طرف سے غفلت برتی جاتی رہی اور مست افکار لوگوں نے 'خانقاہ' اور 'تلاش سکون' وغیرہ کے الفاظ سے قوم کی عملی قوتوں کو بے حس کر دیا۔ انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ خانقاہوں کا اصلی رنگ ناپید ہو گیا ہے اور وہ سکون جو عمل کے نتیجہ کے طور پر حاصل ہوتا تھا عنقا ہے ؎

تھا جہاں مدرسۂ شیری و شاہنشاہی

آج ان خانقہوں میں ہے فقط روباہی

بال جبریل ۱۰۸

تم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

بال جبریل ۲۱۴

حقیقت میں یہ اثر عیسائی ممالک کی خانقاہوں سے لیا گیا جو رہبانیت کا مرکز تھیں۔ عیسائیوں نے حضرت عیسٰیؑ کی طرف پہاڑی کا وعظ منسوب کر کے رہبانیت کو تقویت بخشی۔ پہاڑی کا وعظ یہ ہے :-

"تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا۔ کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے۔ تو دوسرا بھی اُسی کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتہ لینا چاہے۔ تو چوغہ بھی اُسے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے۔ اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔ جو کوئی تجھ سے مانگے۔ اُسے دے۔"

اس قسم کے خیالات کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تجرّد کی زندگی اور رہبانیت کو دین داری کا سب سے اہم جزو قرار دیا گیا۔ یہ آرام و آسائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کی تکلیف و عذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت قرار دیا گیا۔ کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے

ک تفصیل کے لیے معارف القرآن جلد سوم صفحہ ۵۰۱ ملاحظہ ہو۔

کی قسم کھا لی۔ تو کسی نے اپنے آپ کو دلدل میں ڈال دیا۔ کوئی اپنے گ
بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا تو دوسرے نے سایہ میں بیٹھنے کو
اپنے اوپر حرام کر لیا۔ ماں باپ، عزیز و قریب، اہل و عیال
سے پرہیز بلکہ اُن سے نفرت کمال تقویٰ قرار پایا اور اسی پر فخر
کیا جانے لگا[1]

رہبانی زندگی کے اصل سبب پر غور کرنے سے یہ حقیقت روشن
ہو جاتی ہے کہ یہ اُصولِ زندگی اسلام سے کس قدر بعید ہے رہبانیت
کی بنیاد یہ نظریہ ہے کہ دنیا مجموعہ شر ہے۔ مانی[2] پہلا شخص تھا
جس نے اس امر کی طرف نہایت بے باکی سے اشارہ کیا
کہ کائنات شیطان کی فعلیت کا نتیجہ ہے اور اسی لیے شر
اس کے خمیر میں ہے۔ علامہ اقبال کے خیال میں یہی ثنویت
اُس نظامِ فلسفہ کا منطقی جواز معلوم ہوتا ہے۔ جس کی تعلیم ترکِ دنیا
ہے۔ یہ ہمارے زمانہ میں شوپنہار بھی اسی نتیجہ پر پہنچا۔ اگرچہ مانی کے
خلاف اُس نے یہ سمجھا کہ اصول تفرید (یعنی ارادۂ حیات کا معاصیانہ میلان

---

[1] ان واقعات کی تفصیل لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ میں مل سکتی ہے۔ یہ حوالہ سیرۃ النبی
جلد چہارم صفحہ ۲۲۹ سے پیش کیا گیا ہے۔

[2] مانی ایک نیم ایرانی تھا۔ جو ۲۱۵ء یا ۲۱۶ء میں بابل کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کو
عیسائیوں نے بعد میں بے دین فرقہ کے موجد کا لقب دیا۔ لیکن خود عیسائیوں میں رہبانیت
کا تصور کافی حد تک اُس کے نظریہ کی پیداوار ہے۔

خود ارادہ اولیٰ کی سرشت میں موجود ہے اور اس سے علیحدہ آزاد نہیں ہے[1]"
ہر مسلمان یہ جانتا ہے کہ اسلامی عقائد میں یہ نظریے قابل قبول نہیں۔ اور وہ نظام حیات جو ان کی پیداوار ہے ہمارے لیے ہرگز مستحسن اور مناسب حال نہیں[2]

ہندوؤں اور مشرق کی دیگر قوموں میں بھی نفی خودی کی تعلیم ملتی ہے۔ اس کی ابتداء اور ترقی پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ "مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی "انا" محض ایک فریبِ تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام ہی نجات ہے۔

"ہندو قوم کے موشگاف حکماء نے قوتِ عمل کی حقیقت پر نہایت دقیق بحث کی۔ اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ انسانی "انا" کی موجودہ کیفیات اور لوازمات اس کے گزشتہ طریق عمل کا لازمی نتیجہ ہیں اور جب تک یہ قانون عمل اپنا کام کرتا رہے گا وہی نتائج پیدا ہوتے رہیں گے۔ ہندو حکماء نے تقدیر کی مطلق العنانی اور انسانی حریت یا بالفاظ دیگر جبر و

---

[1] فلسفہ عجم صفحہ ۱۱

[2] خود عیسائیوں میں بھی ترکِ دنیا کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ راہبوں کے لباس میں عیش پسندی اور آوارگی عام ہو گئی مجرد راہبہ عورتیں شہوت پرستی کا شکار ہو گئیں۔ راہب مرد و عورتیں لوگوں کی عقیدت سے فائدہ اٹھا کر دولت اکٹھی کرنے اور آرام طلبی و سہل انگاری کی زندگی بسر کرتے۔

اختیار کی گتھی کو عجیب و غریب طریق پر سلجھایا۔ یعنی یہ کہ جب 'انا' کی تعین عمل سے ہے تو 'انا' کے پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ترکِ عمل ہے۔ یہ نتیجہ انفرادی اور ملی پہلو سے نہایت خطرناک تھا (چنانچہ) سری کرشن نے ایک نہایت دلفریب پیرایہ میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات پر تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترکِ کلی نہیں ہے۔ بلکہ ترکِ عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دل بستگی نہ ہو۔ (لیکن جس عروسِ معنی کو سری کرشن بے نقاب کرنا چاہتے تھے۔ سری شنکر کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا اور سری کرشن کی قوم اُن کی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی"۔

حقیقت میں کشمکشِ حیات میں یہ نظریہ شکست کا اعتراف ہے جو صرف شکست خوردہ لوگوں کے لیے روا ہے ؎

کمالِ ترک نہیں آب و گل سے مہجوری

کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

نہ فقر کے لیے موزوں نہ سلطنت کے لیے

وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری

بال جبریل ۶۴

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ

مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خودنگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

ضرب کلیم ۵۵

اسلام میں روح اور جسم کی ایسی تقسیم قابل قبول نہیں جو جسم اور اس کی خواہشات کو دبا کر ختم کر دے۔ جسمانی خواہشات کو مارنے کے لئے جسم کو ایذا دینا بھی جائز نہیں اور نہ ہی کشمکش حیات سے گریز کرنا روا ہے اگر یہ ایسی ہی بے فائدہ ہوتی تو خلافت ارضی آدم کی بجائے فرشتوں کو سونپ دی جاتی جنہوں نے آدم کے مقرر ہونے پر اسی وجہ سے اظہار تعجب بھی کیا تھا کہ :-

اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ج	یا اللہ کیا تو ایسا خلیفہ بنا رہا ہے جو زمین میں خونریزی اور فساد کے ہنگامے برپا کر دے گا۔

اللہ تعالےٰ نے رہبانیت کی زندگی پسند نہیں فرمائی بلکہ انسانی ذہن نے خود ایجاد کر لی ہے :-

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ	پھر ان کے بعد اور رسولوں کو یکے بعد دیگرے بھیجتے رہے اور ان کے بعد ہم نے عیسےٰ ابن مریم کو بھیجا اور ہم نے

اٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِیَّةَ ِۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا ۚ فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ

۵۷/۲۷

اُسے انجیل دی ۔ اور جن لوگوں نے اُس کی پیروی کی ۔ ہم نے اُن کے دلوں میں شفقت و مہربانی کے جذبات ، پیدا کر دئے (وہ گئی) رہبانیت ۔ سو اُسے اُنھوں نے خود ہی ایجاد کر لیا تھا ۔ ہم نے اُن پر فرض نہیں کی تھی ۔ اُنھوں نے (اسے اختیار تو کیا تھا) حق تعالےٰ کی رضامندی کی خاطر (لیکن چونکہ غیر فطری چیز تھی اس لیے) اس کی پوری پوری رعایت نہ رکھ سکے سو ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہم نے اُن کو ان کا اجر دے دیا ۔ مگر زیادہ تر ان میں سے نافرمان ہی ہیں ۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سکندر اعظم کے زمانہ میں جب قدیم دنیا میں آمد و رفت اور تعلقات پیدا ہوئے تو بودھ مذہب کا ترکِ دنیا کا فلسفہ دوسرے ممالک میں پھیل گیا اور عیسائیت کے خیالات سے مل کر رہبانیت کا پورا نظام کھڑا ہو گیا ۔ بودھ مت کی ترقی کے متعلق گیگر لکھتا ہے کہ سکندر کے بعد کے زمانے میں اسے ایران

میں بڑی قوت حاصل ہوئی اور اس کے پیرو طبرستان تک پھیل گئے۔ یہ بات تو خاص طور پر یقین کرنے کے قابل ہے کہ بودھ مذہب کے اکثر پیشوا باختر میں بھی پائے جاتے تھے۔ یہ صورت حال جو غالباً پہلی صدی ق م میں ظہور پذیر ہوئی۔ ساتویں صدی عیسوی تک قائم رہی" [۱]

مسلمان بھی بدھ مت کے اثرات سے نہ بچ سکے۔ اپنے ایک مکتوب میں علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ "غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (سمنیت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں" تصوف اور وجودی فلسفے کے وہ مخالف تھے۔ کیونکہ ان کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔ آپ نے اسی وجہ سے تصوف کو مسلمانوں کی ملی و سیاسی زندگی کے لیے مضر بتایا ہے۔ اس کی سند میں آپ خیر القرون قرنی والی حدیث کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں۔ کہ "اس میں نبی کریمؐ فرماتے ہیں کہ میری امت میں تین قرنوں کے بعد سمن (و یظھر فیھم السمن) کا ظہور ہوگا ... "سمن" سے مراد رہبانیت ہے۔ جو وسط ایشیا کی اقوام میں مسلمانوں سے پہلے عام تھی" [۲]

قرآن و حدیث تصوف کے لفظ تک سے ناآشنا ہیں۔ شروع

---

[۱] فلسفۂ عجم صفحہ ۱۲۶ [۲] علامہ اقبال کا خط سید سلیمان ندوی کے نام۔ اقبال نامہ صفحہ ۸۰

شروع میں ایسے لوگوں کو جو تارک الدنیا ہو کر صرف عبادت میں مشغول ہو جاتے تھے۔ صوفی کہا جاتا تھا۔ دوسری صدی ہجری میں عربی زبان میں تصوف کا لفظ شروع ہوا اور آہستہ آہستہ اس کے متعلق کئی قسم کی اصطلاحیں پیدا ہو گئیں۔ علامہ اقبال نے "فلسفہ عجم" میں اجمالی طور پر یہ بتایا ہے کہ صوفی مصنفین اپنے خیالات کو قرآن کے نقطۂ نظر سے کس طرح جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ثابت کرنے کے لیے کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے کہ پیغمبر عرب نے فی الواقعی حضرت علیؓ یا حضرت ابوبکرؓ کو کوئی باطنی علم سکھلایا تھا۔ بہرصورت صوفیاء کا یہ دعوےٰ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے قرآن کی تعلیم کے ماسوا ایک باطنی تعلیم (حکمت) بھی دی تھی۔ اس دعویٰ کی تائید میں وہ قرآن کی حسب ذیل آیت پیش کرتے ہیں۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۲/۱۵۱	جیسے ہم نے تم ہی میں کے ایک رسول بھیجے جو ہماری آیتیں تم کو پڑھ کر سناتے اور تمھاری اصلاح کرتے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتے اور تم کو ایسی ایسی باتیں بتاتے جو تم کو معلوم نہ تھیں۔

ان کا یہ خیال ہے کہ "حکمت" کا جو ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے وہ ایسی چیز ہے جس کو قرآن کی تعلیم میں بیان نہیں کیا گیا خود

پیغمبر علیہ السلام نے بارہا فرمایا ہے کہ قرآن کی تعلیم آپ سے پہلے کے پیغمبروں نے بھی دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس 'حکمت' کو قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے تو اس ایت میں حکمت کا جو لفظ آیا ہے وہ حشو و زائد ہوگا" [۱]

پہلا دور جس میں اسلام کی اصل روح کارفرما رہی کم و بیش ایک صدی تک رہا۔ اس دور کے صوفیاءُ کا مقصد جہاد، اشاعت اسلام اور جدّو جہد تھا وہ زمانہ یکسر عمل کا تھا اور اس وقت تصوف کا مفہوم بھی 'اخلاص فی العمل' لیا جاتا تھا۔ اس پر علامہ اقبال کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ فلسفۂ عجم میں انھوں نے "یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تصوّف اُن مختلف عقلی و اخلاقی قوتوں کے باہمی عمل و اثر کا لازمی نتیجہ ہے جو ایک خوابیدہ روح کو بیدار کرکے زندگی کے اعلیٰ ترین نصب العین کی طرف راہنمائی کرتی ہیں" [۲]

لیکن جب آہستہ آہستہ مذہبی قدور کی حُرمت کم ہوگئی۔ تو مذہب بھی خیالی موشگافیوں تک محدود ہو گیا۔ علامہ اقبال ایسے تصوف کے خلاف بغاوت کرتے ہیں جو "فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کرکے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے" [۳]

---

[۱] فلسفۂ عجم صفحہ ۱۳۶ [۲] تمہید فلسفۂ عجم [۳] حافظ محمد اسلم جیراجپوری کے نام علامہ اقبال کا مکتوب۔ اقبال نامہ صفحہ ۵۲

وہ لوگ جو عمل سے بیگانہ ہو کر اِس قسم کی وارداتِ قلب کو بیان کرتے ہیں۔ نوعِ انسانی کے لیے کوئی پیغام نہیں دے سکتے۔ اُن کا تجربہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے جو خاص ریاضتوں اور طریقوں سے انھیں خود اپنے آپ کو محسوس ہوتا ہے۔ بعض اوقات مختلف اشخاص کے یہ نتائج ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی ہر ایک اپنے تجربہ کو ہی حقیقت قرار دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان تجربات کو کوئی عالمگیر سند حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ آہستہ آہستہ روح و مادہ اور دین و دنیا کی ثنویت کا پہلو نکل آتا ہے۔ جو قرانی نظریہ کے مخالف ہے ؎

بچشمے خلوتِ خود را بہ بینند | بچشمے جلوتِ خود را بہ بینند
اگر یک چشم بربندد گناہے است | اگر باہر دو بیند شرطِ راہے است

زبورِ عجم ۲۰۸

اس قسم کا تصوّف پہلے پہل باقاعدہ طور پر ابن[1] عربی نے پیش کیا اور اپنے کشف کی تاویل میں قرآن اور احادیث نبوی سے سند پیش کرنے کی کوشش کی وحدت الوجود (جسے فارسی میں ہمہ اوست سے ظاہر کیا جاتا ہے) پر مفصل بحث اپنی کتاب 'فصوص الحکم' میں کی۔

---

[1] محی الدین ابن عربی (۵۶۰ھ - ۶۳۸ھ) اندلس میں پیدا ہوئے۔ ۵۹۰ھ میں وطن سے سیاحت کو نکلے۔ مکہ اور موصل وغیرہ مقامات میں پھرے اور دمشق میں قیام کیا۔ جہاں انتقال ہوا۔

توحید کے متعلق اُس کا نظریہ یہ ہے کہ وجود ایک ہی ہے۔ وہی موجود ہے اور ہر دوسری چیز فقط اس کا مظہر ہے دوسرے الفاظ میں موجود صرف خدا ہے یہ عالم یا کثرت جو ہم دیکھتے ہیں۔ صرف تجلیات وحدت کے طور پر ہیں۔ بذاتِ خود عالم کا کوئی وجود نہیں[1]۔ دنیا میں جو کچھ ہے وہ اس کے سوائے کچھ نہیں کہ ذاتِ خداوندی مختلف پیکروں میں جلوہ نما ہے۔ ہمہ اوست کے عقیدہ سے مسئلہ عینیت کی ایسی بنا پیدا ہوئی کہ خالق اور مخلوق متحد ہو گئے۔ مثال کے طور پر اشعار ذیل ملاحظہ ہوں ؎

خود کوزہ و خود کوزہ گرو خود گلِ کوزہ
خود بر سر بازارِ خریدار برآمد
خود اناالحق زد از لبِ منصور
خود برآمد ز شوق بر سرِ دار
من ہم زمینم ہم سماہم بالتوہستم جملہ جا
من مصطفٰے را ہم خدا، من ملحد دیرینہ ام

ابن عربی کے خیالات کو اس طرح بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ عالم ہی خدا ہے۔ اسی میں وحدت نمودار ہو کر گم ہو جاتی ہے اور ان تجلیات کے ماورا وحدت کا کوئی وجود نہیں۔ اور اس لیے سالک کو اس عالم کے ماوراء خدا کی تلاش میں سرگردان

---

[1] الاعیان ماشمت رائحۃ من الوجود۔ اعیان ثابتہ نے وجود خارجی کی بو تک نہیں سونگھی۔

نہیں ہونا چاہیئے[1]

ابن عربی کے خیالات سے بعض دفعہ یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے شنکر (جو آٹھویں صدی عیسوی میں ہوا) کے مسئلہ ویدانت کو وحدت الوجود کی صورت میں دنیائے اسلام کے سامنے پیش کردیا اور یہ اس کے علم اور قابلیت کا زور تھا کہ اس نے متصوفین اسلام پر اتنا گہرا اثر ڈالا۔ لیکن فلسفے کی مشابہت کے باوجود ہم فان کریمر ڈوزی اور دیگر ایسے مفکرین سے متفق نہیں ہو سکتے کہ ایرانی تصوف کا ماخذ ہندی ویدانت ہے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ فان کریمر نے ایک غلط فہمی کی بنا پر تصوف کے پورے واقعہ کو ویدانتی تصورات کے اثر سے منسوب کردیا۔ ویدانت کے طریقوں کی نوعیت بالکل غیر اسلامی ہے اور اعلےٰ درجہ کے صوفیاء ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہندی ویدانت ایک خشک نظام فکر ہے۔ تصوف ایک طرف تو بدھ مت کے تصور نروان (فنا) کو اپنے اندر جذب کرکے اس تصور کی روشنی میں ایک مابعد الطبعی نظام تعمیر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسری طرف وہ اسلام سے بے تعلق نہیں ہونا چاہتا اور کائنات سے متعلق اپنے نقطۂ نظر کا جواز قرآن سے پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے مقام پیدائش کے جغرافیائی موقع ومحل کی طرح خود بھی آریائی وسامی مذاہب

[1] اس کے نزدیک اللہ اصل ہے اور عالم اس کا ظل لیکن ظل چونکہ اصل کی نمود ہے اس لیے حقیقت میں وہ اصل ہی ہے اور اس لیے عالم اور خدا یک دگر ہیں [2] فلسفۂ عجم صفحہ ۱۵۱

کے اثرات کے وسط میں واقع ہے اور دونوں طرف سے وہ تصورات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ لیکن خود ان پر بھی اپنی شخصیت کا رنگ چڑھا دیتا ہے (گویہ درست ہے کہ) اس کی نوعیت زیادہ تر آریائی ہے نہ کہ سامی"[1]

بہرحال ابن عربی کے بعد عقیدہ وحدت الوجود مسلمانوں میں زور پکڑ گیا۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ "علماء قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہ[2] اور حکماء میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر ہیجان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ مگر افسوس ہے کہ واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ ملا محسن فانی کشمیری نے اپنی کتاب 'دبستان مذاہب' میں اس حکیم کا تھوڑا سا تذکرہ لکھا ہے۔ جس سے اس کے خیالات کا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا" انہوں نے 'رجوع الی الاسلاف' کی تحریک سے ملت میں نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن تصوف مسلمانوں میں داخل ہو چکا تھا۔ اولیاء کی کرامات میں عقیدت ہوتے ہوتے کئی طرح کے خلاف اسلام طریقے رائج ہو گئے۔ سماع اور سکر کا رواج ہو گیا اور شریعت اور سنت بندی سے بے پروائی بڑھتی گئی۔ اسلام کی اصل روح فنا ہو گئی اور تصوف

---

[1] فلسفہ عجم صفحہ ۱۳۵

[2] ابن تیمیہ (۶۶۱ھ سے ۷۲۸ھ) مشہور علمائے اسلام سے ہیں۔ مذہبیات وجود کے رد میں ان کی کتاب 'فی ابطال وحدت الوجود' مشہور ہے۔

کی موشگافیاں اسلام تصوّر کی جانے لگیں۔

اس تصوّف اور اس کی شاعری کے متعلق علاّمہ اقبال اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ سب کی سب مسلمانوں کے پولٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے۔ جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی۔ تو پھر اس قوم کا نکتہ نگاہ بدل جایا کرتا ہے[1] اُن کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دُنیا موجب تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی کاہلی اور اس شکست کو جو اُن کو تنازع للبقا میں ہو چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔[2]
اسی لیے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ؎

---

[1] جب چنگیز خاں و ہلاکو نے مسلمانوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا تو اُن کی آنکھوں کے سامنے فنا، زوال اور دنیاوی معاملات سے قطع تعلق کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اُن کا میلانِ طبع زہد و پارسائی اور ترکِ دنیا کی طرف زیادہ ہو گیا۔ اس زندگی کو عالم فانی کی ہوس ظاہر کر کے توکّل و قناعت کو ترجیح دینے لگے۔ آہستہ آہستہ مسلمان درگور و مسلمانی درکتاب، کا مصداق ہو گئے۔ مرنے سے پہلے مرجاؤ، غریبی اور افلاس بڑی نعمت ہیں وغیرہ آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔

[2] سراج دین پال کے نام علاّمہ اقبال کا مکتوب اقبال نامہ صفحہ ۷۵

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ نقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آرہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری

صوفیانہ نصب العین نے آٹھویں صدی کے اختتام اور نویں صدی کے نصف اوّل میں ترقی کی اور اس کے بعد اِس کا فلسفیانہ جواز بھی پیش کیا گیا۔ علامہ اقبال نے اُس زمانہ کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ " یہ زمانہ سیاسی بے چینی کا تھا۔ آٹھویں صدی کے نصف آخر میں اُس سیاسی انقلاب کے علاوہ جس نے سلطنتِ اُمیہ کو اُلٹ دیا اور بھی کئی واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ جیسے زنادقہ پر ظلم و تعدی۔ ایرانی ملحدین کی بغاوت (۷۵۵-۷۶۶ء و ۷۶۶-۷۶۷ء) خراسان کا نقاب پوش پیغمبر (۷۷۷-۷۸۰ء) وغیرہ۔ اُن لوگوں نے اپنے سیاسی منصوبوں کو مذہبی تصورات کے روپ میں پیش کیا۔ نویں صدی کے آغاز میں ہارون کے بیٹوں (مامون اور امین) میں سیاسی اقتدار کے لیے زبردست جنگ رہی۔ اس کے کچھ زمانہ بعد ہی اسلامی ادبیات کے عہدِ زرّین کو بابک کی مسلسل بغاوت سے سخت صدمہ پہنچا (۸۱۶-۸۳۷ء) یہ اور اسی قبیل کے دیگر حالات کی متحدہ قوت لے آئی ایسے لوگوں کو جن کی سیرت زاہدانہ واقع ہوئی تھی۔ اپنی طبیعت کو اس مسلسل بے چینی کے منظر سے ہٹا کر ایک پُر سکون مراقبہ کی زندگی کی طرف رجوع [illegible] ان ابتدائی

مسلمان مرتا ضین کی حیات و فکر کی ساری نوعیت کے ساتھ ساتھ وحدت الوجود کا ایک وسیع نظریہ بتدریج وجود میں آگیا [1]

تصوف کا سب سے پہلا شاعر فخر الدین عراقی اور سب سے آخری حافظ ہے عراقی نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیم کو نظم کیا ہے سکون و مراقبہ کی زندگی کا اثر آہستہ آہستہ تمام ادبیات اسلامیہ میں ظاہر ہونے لگا اور بتدریج قوم کے جذبات سرد پڑتے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ قوم کا عمل، نفی خودی کے مسئلہ میں تبدیل ہو گیا۔ اس فلسفہ اور لٹریچر کی تشریح کرتے ہوئے علامہ اقبال لکھتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں۔ جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں۔ جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا۔ تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی۔ جس کی بنا وحدت الوجود تھی ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔ اور اسلام کی ہر محمود شے کو

[1] فلسفہ عجم صفحہ ۱۲۷ - ۱۳۰

ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ اگر اسلام افلاس کو بُرا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلےٰ درجہ کی سعادت قرار دیتا ہے اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لیے ضروری تصوّر کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعارِ اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً۔

غازی زپئے شہادت اندر تگ و پوست

غافل کہ شہید عشق فاضل تر ازوست

در روز قیامت ایں باد کے ماند

ایں کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست

" یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابلِ تعریف مگر انصاف سے دیکھئے تو جہادِ اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے۔ اس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے۔ بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے آبِ حیات پلایا گیا ہے۔ آہ! مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں" [1]

اپنے ایک شعر میں ایسے ہی خیال پر مسلموں کی ناخوش اندیشی پر افسوس کیا ہے ؎

[1] سراج الدین پال کے نام علامہ اقبال کا مکتوب۔ اقبال نامہ صفحہ ۳۵

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے ؟ فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

بال جبریل ۴۷

صوفی نغمۂ قوال میں مست ہو کر عمل سے بیگانہ ہو گیا ؎

صوفیِ پشمینہ پوشِ حال مست از شرابِ نغمۂ قوال مست

رموز ۱۴۲

درویش کا کام دراصل یہ ہے کہ حکمِ حق کو جہاں میں جاری کرے۔ اگر نان جویں کھاتا ہے تو کرّاری بھی اُس کے لیے ضروری ہے ؎

وائے درویشے کہ ہوئے آفرید باز لب بربست و دم در خود کشید

حکمِ حق را در جہاں جاری نکرد نانے از جو خورد و کرّاری نکرد

خانقاہے جست و از خیبر رمید راہبی ورزید و سلطانی ندید

جاوید نامہ ۱۵۲

ابلیس اپنے مشیروں کو یہی ہدایت کرتا ہے کہ مسلمان کردار سے بیگانہ اور سوزِ یقین سے عاری رہیں تو اچھا ہے۔ وہ جتنے مزاجِ خانقاہی میں پختہ ہوں گے۔ آئینِ پیغمبر چشمِ عالم سے اتنا ہی پوشیدہ رہے گا ؎

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئین تو خوب

یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقین!

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے

یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوّف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ارمغانِ حجاز ۲۲۸

ہندوستان کے حالات پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی حکمت عملی نے مسلمانوں کے مذہبی شعور کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس نے " زرتشتیت کی مدد سے خود اپنے لیے اور درباریوں کے لیے جن پر ایرانیت زیادہ غالب تھی ایک جدید مذہب کی بنیاد ڈالی "[1] اس کے بعد دارا شکوہ نے مسلمانوں کے مذہبی شعور کو اور بھی زیادہ کمزور کیا ہے

تخم الحادے کہ اکبر پرورید باز اندر فطرتِ دارا دمید

رموز ۱۱۲

[1] فلسفۂ عجم صفحہ ۲۲۵

لیکن شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے علماء اسلام کو قرآن و حدیث کی طرف متوجہ کر کے تصوف میں انقلاب پیدا کیا آپ نے غیر اسلامی تاثرات سے تصوف کو پاک کیا اور پھر اسلام کا رُخ اس کے اصل سرچشمہ قرآن اور رسول کی طرف پھیر دیا۔ شاہ سید احمد بریلوی نے بھی سکر اور رقص و سرود کی جگہ جہاد پر زور دیا۔ چنانچہ انھوں نے خود سکھوں کے خلاف جو پنجاب میں مسلمانوں پر ظلم کر رہے تھے۔ جہاد میں حصہ لیا اور کئی لڑائیوں میں شامل ہوئے اور شاہ اسمٰعیل شہید کے ساتھ ۱۲۴۶ھ میں شہید ہوئے۔

علامہ اقبال نے مسلمانوں کو کتاب و سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مُردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار!

ضربِ کلیم ۲۵

اس بحث سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ اقبال سرے سے روحانی تجربہ کا مخالف ہے۔ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے

ہیں کہ خواجہ نقشبند اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلہ نادریہ کا ہے۔ جس سے میں خود بیعت رکھتا ہوں۔ حالانکہ حضرت محی الدین (عبدالقادر گیلانی) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا" [1]

خطبات میں وہ ایک شخص کے تجربہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نے بیان کیا کہ زمین وآسمان، کرسی، جنت اور دوزخ سب کی ہستی میرے لیے ختم ہو گئی ہے۔ جب میں اپنے اردگرد نظر ڈالتا ہوں تو انھیں کہیں بھی موجود نہیں پاتا۔ جب میں کسی کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو کسی کو نہیں پاتا۔ حتےٰ کہ اپنی ذات کو بھی کھو دیتا ہوں۔ جب اس کا یہ تجربہ شیخ احمد سرہندی سے بیان کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس تجربہ کی بنا قلب کی ہر لحہ تبدیل ہونے والی زندگی پر ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابھی قلب کے مقامات کا ایک چوتھائی بھی طے نہیں کیا۔ پہلے درجہ پر پہنچنے کے لیے اسے باقی کے تین چوتھائی پہ عبور ہونا ضروری ہے۔ اور پھر اس پہلے درجہ کے بعد اور مقام بھی ہیں۔ جو تمام یک جا ہو کر عالم امر کو ترتیب دیتے ہیں [2]

علامہ اقبال کا بھی یہ خیال ہے کہ ذات حق کی تلاش میں انسانی خودی کو بڑا اندیشہ یہ ہے کہ وہ آخری منزل پر پہنچنے سے قبل رستہ میں

---

[1] اقبال نامہ [2] خطبات صفحہ ۱۹۲

کسی مقام پر کھو جائے ۔ مشرقی صوفیا کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خطرہ حقیقی ہے ۔ شیخ احمد سرہندی نے اس کی اصلاح کی طرف توجہ دی اور اپنے وقت کے صوفی مسلک پر نہایت بیباکی سے تنقید کی ۔ رستہ کے ہی کسی مقام پر کھو جانے کے خطرہ کا سبب عیاں ہے ۔ خودی کا منتہائے نظر صرف کچھ دیکھنے کا نہیں بلکہ حقیقت میں کچھ بننے کا ہے اور اس آخری کوشش سے ہی خودی اپنا وجود قائم کر سکتی ہے ۔ خودی کا مقصود تفرد سے آزادی حاصل کرنا نہیں بلکہ اس کا ایسا صحیح تعین کرنا ہے جس سے اس کا قیام ممکن ہو اور اس کے اس ارادہ کو تقویت ہو کہ دنیا صرف دیکھنے اور جاننے کے لیے نہیں ۔ بلکہ مسلسل و پیہم عمل سے تعمیر و تعمیر دیگر کے لیے ہے[1]

اسی خیال کے پیش نظر فرماتے ہیں ؎

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات
ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات
خود گیری و خودداری و گلبانگِ انا الحق
آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست
خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات

ارمغان حجاز ۲۶۱

علامہ مرحوم اُس قوم کی حالت پر افسوس کرتے ہیں جسے اپنے

[1] خطبات صفحہ ۱۹۷

بےعملی کی وجہ سے دوسری قوموں کی تقدیر کا درجہ حاصل تھا اور جسے قوانین الٰہیہ کو عملی طور پر رائج کرنے کے لیے زمین پر متمکن کیا گیا تھا۔ لیکن وہ کشمکش حیات سے گھبرا کر شرابِ الست میں مست ہو کر کشف و کرامات میں کھو کر رہ گئی ہے

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست!
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

ضرب کلیم ۲۴

آپ نے بے عمل صوفیوں کا مقابلہ مردان خود آگاہ و خدا مست سے کیا ہے۔ جن کی تکبیریں وسعتِ افلاک میں زلزلہ پیدا کر دیتی ہے ہے

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

بال جبریل ۱۹۶

ملا کے مذہب میں غربت اور بھوک کی زندگی کو خدا کے ہاں کا خاصہ خیال کیا جاتا ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس غریبی محتاجی کو فقر کا نام دیا جاتا ہے۔ حالانکہ فقر کا اسلامی مطلب ہے کہ مسلمانوں کا خلیفہ ہوتے ہوئے اور وسیع سلطنت رکھتے سادہ زندگی بسر کرے۔ غربت و افلاس والا فقر غیر اسلامی ہے۔ ملا کا فقر اُسے خلوت نشین بنا کر نکما کر دیتا ہے لیکن مومن کا فقر اُسے تسخیر جہات کے قابل بناتا ہے ؎

فقرِ قرآں احتسابِ ہست و بود ۔ نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات ۔ بندہ از تاثیر او مولا صفات
فقرِ کافر خلوتِ دشت و در است ۔ فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است
زندگی آں را سکونِ غار و کوہ ۔ زندگی ایں را ز مرگ با شکوہ
آں خدا را جستن از ترکِ بدن ۔ ایں خودی را چوں چراغ افروختن
فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر ۔ از نہیبِ او بلرزد ماہ و مہر
فقرِ عریاں گرمیٔ بدر و حنین
فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؓ

پس چہ باید کرد ۲۶

انہی خیالات کو اپنے اُردو کلام میں یوں بیان فرمایا ہے ؎

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی

ہوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی!
ملا روح و بدن کی ہے وانمود اس کو
کہ ہے نہایتِ مومن خودی کی عریانی
یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولت سلمانی و سلیمانی! ضربِ کلیم ۴۷

بالِ جبریل میں ہر دو کا مقابلہ کیا ہے ؎

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری؛
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری!
اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری!
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری!
میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری

بالِ جبریل ۲۴۳

علامہ نے فقرِ غیور کو اسلام کے مرادف بتایا ہے ؎

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے ، فقرِ غیور!

ضربِ کلیم ۲۵

یہی وہ فقر ہے۔ جس کے متعلق حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ اور جس کی بدولت وہ قوم پیدا ہوئی
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سردارا
تمدن آفریں، خلاقِ آئینِ جہانداری
وہ صحرائے عرب، یعنی شتربانوں کا گہوارا
سماں الفقرُ فخری کا رہا شانِ امارت میں
"بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را"
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرانشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہانبان و جہاں آرا
بانگ درا ۱۹۸

اسی فقر کی وجہ سے آدم ظلِّ سبحانی کا درجہ رکھتا ہے ؎
کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظلِّ سبحانی
ضربِ کلیم ۲۶

اقبال کا قلندر خرقہ پہنتا ہے لیکن بادشاہوں سے خراج بھی لیتا ہے جلوت وخلوت اور رزم و بزم میں اُس کے معرکے یوں بیان کئے ہیں ؎
قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گل کوشند
ز شاہ باج ستانند و خرقہ مے پوشند

بجلوت اندر کند ے بہ مہر و ماہ پیچند
بخلوت اندر زماں و مکان در آغوشند!

بروز بزم سراپا چو پرنیاں و حریر
بروز رزم خود آگاہ و تن فراموشند

نظام تازہ بچرخ دو رنگ می بخشند
ستارہ ہائے کہن را جنازہ بردوشند

زبور عجم ۱۷۰

اسلامی فقر کا مدعا ہرگز یہ نہیں ہے کہ کاخ وکو سے درگزر کر کے رہبانیت اختیار کرلی جائے بلکہ انسان کا کام جہانِ رنگ و بو میں حسب منشا تصرف کرنا ہے ؎

من نگویم درگزر از کاخ و کوئے | دولت تست ایں جہانِ رنگ و بوئے
دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر | صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر
تیشۂ خود را بکہسارش بزن | نورے از خود گیر و بر نارش بزن
از طریق آذری بیگانہ باش | بر مرادِ خود جہانِ نو تراش
دل برنگ و بوئے و کاخ و کو مدہ | دل حریم اوست جز با او مدہ
مردنِ بے برگ و بے گور و کفن؛ | گم شدن در نقرہ و فرزند و زن
ہر کہ حرفے لا الٰہ از بر کند | عالمے را گم بخویش اندر کند

فقر جوع و رقص و عریانی کجاست
فقر سلطانی است رہبانی کجاست جاوید نامہ ۸۱

تکمیلِ خودی کے لیے مسلسل عمل کی راہیں تلاش کرنا انسان کا کام ہے۔ ورنہ اس کے "سرائے ہست و بود" میں آنے کا کوئی فائدہ نہیں ؎

در سرائے ہست و بود آئی؟ میا | از عدم سوئے وجود آئی؟ میا
در بیائی چوں شرار از خود مرد | در تلاشِ خرمنے آوارہ شو!
تاب و تب داری اگر مانندِ مہر | پا بنہ در وسعتِ آبادِ سپہر
کوہ و مرغ و گلشن و صحرا بسوز | ماہیاں را در تہ دریا بسوز
سینۂ داری اگر در خورد تیر | در جہاں شاہیں بزی شاہیں بمیر

زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟
یک دمِ شیری بہ از صد سال میش — جاوید نامہ ۲۱۴

ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرکے اپنی خودی کو مضبوط کرنا ضروری ہے۔ ایک ہرن اپنے دوسرے ساتھی کو جو فتنۂ صیاد سے محفوظ ہونا چاہتا ہے یہ مشورہ دیتا ہے ؎

رفیقش گفت اے یارِ خرد مند | اگر خواہی حیات اندر خطر زی
دما دم خویشتن را بر فساں زن | ز تیغِ پاک گوہر تیز تر زی

خطر تاب و تواں را امتحان است
عیارِ ممکنات جسم و جان است

پیامِ مشرق ۱۲۴

زندگی کی حقیقت یوں بیان کی ہے ؎

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی!
بانگ درا ۲۹۳

جب تک ہم زندگی کی جدوجہد میں پورے طور پر شریک ہو کر طوفان سے دو چار نہ ہوں۔ ہماری خودی کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اقبال اس فلسفہ کا مخالف ہے جو یہ تعلیم دیتا ہے، اگر خواہی سلامت، بر کنار است، وہ تو عین دریا میں کود جانے کی تلقین کرتا ہے ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز — حیاتِ جاوداں اندر ستیز است
پیام مشرق ۷۱

اسی خیال کو ایک اور رباعی میں پیش کیا ہے ؎

سکندر با خضر خوش نکتۂ گفت — شریکِ سوز و سازِ بحر و بر شو
تو ایں جنگ از کنارِ عرصہ بینی — بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو
پیام مشرق ۲۷

انسان کو گرداب و نہنگ کی تلاش میں رہنا چاہیئے۔ ساحل اگرچہ خطرات سے محفوظ ہوتا ہے۔ لیکن وہاں خار و خس کے سوا اور کچھ نہیں ملتا ؎

دریا میں موتی! اے موجِ بیباک — ساحل کی سوغات! خار و خس و خاک
ضرب کلیم ۱۱۱

بلند پروازی سے ہی مہر و ماہ کو شکار کیا جا سکتا ہے ؎

تو در زیرِ درختاں ہمچو طفلاں آشیاں بینی ؎
بہ پرواز آ کہ صیدِ مہر و ماہے می تواں کردن   زبورِ عجم ۱۵۱

اسی خیال کے ماتحت علامہ اقبال پروانہ کو عام شاعروں کی طرح داد نہیں دیتے کیونکہ وہ اپنے آپ کو شمع پر نثار کر کے زندگی کی کشاکش سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اُس کا یہ سوز عمل کے منافی ہے۔ پروانہ وہ قابل تعریف ہے جو شعلہ نوش ہو نہ وہ جو اپنی ہستی کو ہی مٹا بیٹھے ؎

بہل افسانۂ آں پا چراغے   حدیثِ سوزِ او آزارِ گوش است
من آں پروانہ را پروانہ دانم   کہ جانش سخت کوش و شعلہ نوش است

پیامِ مشرق ۲۴

علامہ مرحوم مسلمانوں کی پیر پرستی کے اسی وجہ سے مخالف ہیں کہ وہ مسلمانوں کی خودی کو کمزور کر کے بے عملی کو ہوا دیتے ہیں۔ ناداں مسلمان عمل سے بے بہرہ ہو کر پیر کے بھروسہ پر پڑے رہتے ہیں۔ اور اس طرح خوگر غلامی میں پختہ ہو جاتے ہیں ؎

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم
اہلِ سجّادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور
سیکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام

خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

ضربِ کلیم ۱۲۵

اہلِ سجادہ و اہلِ سیاست کا منتہائے نظر جب یہ ہو کہ اپنے پیروؤں کی کثرت سے اپنا اقتدار قائم کریں تو وہ حقیقت سے دور ہو جاتے ہیں۔ منصب پرستی سے وہ دین فروشی پر اُتر آتے ہیں۔ قوم کی حالت اُس وقت بالکل گر جاتی ہے۔ جب ہر لمبے بالوں والا خرقہ پوش بن کر پھرنے لگے ۔

دِل ز نقشِ لا اِلٰہ بیگانۂ — از صنم ہائے ہوس بت خانۂ
می شود ہر مو درازے خرقہ پوش — آہ ازیں سوداگرانِ دین فروش
با مریداں روز و شب اندر سفر — از ضرورت ہائے ملت بے خبر
دیدہ ہا بے نور مثلِ نرگس اند — سینہ ہا از دولتِ دل مفلس اند
واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست — اعتبارِ ملتِ بیضا شکست
واعظِ ما چشم بر بت خانہ دوخت
مفتیٔ دینِ مبیں فتوے فروخت — اسرار ۹۰

کاش ہمارے پیر و مرشد تخیلِ ملکوتی اور جذبہ ہائے بلند سے اپنے قافلہ کی رہبری کر سکتے ۔

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند — ضربِ کلیم ۱۶۰

اقبال کی تعلیم سخت کوشی کی ہے۔ اسرارِ خودی میں الماس کوئلہ کی مثال سے سبق دیا ہے کہ اگرچہ دونوں کے کیمیاوی عناصر ایک دوسرے سے ملتے ہیں لیکن سخت کوشی کے باعث ایک الماس ہوکر بادشاہوں کے تاج میں لگا اور دوسرا نرمی کی وجہ سے کوئلہ رہا ؎

گفت با الماس در معدن زغال   اے امینِ جلوہ ہائے لا زوال
ہمدمیم و ہست و بودِ ما یکیست   در جہاں اصلِ وجودِ ما یکیست
من بکاں میرم ز دردِ ناکسی   تو سرِ تاجِ شہنشاہاں رسی
قدرِ من از بدگلی کمتر ز خاک   از جمالِ تو دلِ آئینہ چاک
گفت الماس اے رفیقِ نکتہ بیں!   تیرہ خاک از پختگی گردد نگیں
پیکرم از پختگی ذو النور شد   سینہ ام از جلوہ ہا معمور شد

خوار گشتی از وجودِ خامِ خویش
سوختی از نرمیٔ اندامِ خویش   اسرار ۶۴

علامہ اقبال کی تعلیم یہ ہے ؎

فارغ از خوف و غم و وسواس باش
پختہ مثلِ سنگ شو الماس باش
در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی ناکسی ناپختگی است

اسرار ۶۴

ناتوانی سرمایۂ زندگی کے لیے ایسی رہزن ہے جو کئی بھیس بدل لیتی ہے۔ کبھی تو مجبوری کا نام دے کر خاموشی اختیار کر لیتی ہے اور کبھی رحم و انکسار کے خوش کن لفظوں میں اپنی تلخی کو چھپا جاتی ہے ؎

ناتوانی زندگی را رہزن است   بطنش از خوف و دروغ آبستن است
گاہ اورا رحم و نرمی پردہ دار   گاہ مے پوشد ردائے انکسار
گاہ او مستور در مجبوری است   گاہ پنہاں در تہہ معذوری است
چہرہ در شکلِ تن آسانی نمود
دل ز دستِ صاحبِ قوت ربود   اسرار ۵۶

مسولینی نے کہا تھا کہ جس کے پاس فولاد ہے وہ روٹی کا بھی مالک ہے۔ علامہ اقبال نے اس کی ترمیم یوں کی کہ جو خود فولاد ہے۔ سب کچھ اسی کے پاس ہے۔ شخصی و قومی زندگی کا راز سخت کوشی اور عمل میں ہے۔ ناتوانی کا نتیجہ اپنے وجود کو ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اگر انسان اپنی تعمیر خود نہ کرے تو کوئی دوسرا اس کی خاک سے خشت تیار کر لیتا ہے ؎

سنگ شو اے ہمچو گل نازک بدن   تا شوی بنیادِ دیوارِ چمن
گر بنا سازی نہ دیوار و درے   خشت از خاکِ تو بندد دیگرے

اسرار ۵۴

اسرار میں ایک طائر کا ذکر کیا ہے جو پیاس سے بے تاب پانی

کی تلاش میں پھر رہا تھا اُسے ایک ریزۂ الماس دکھائی دیا۔ جس کی چمک سے فریب کھا کر اُسے پانی کا قطرہ سمجھا اور اپنی منقارِ ہوس کو اُس پر تیز کرنے لگا۔ نتیجہ الماس کی زبان سے یوں بیان کیا ہے ؎

قصدِ آزارم کنی دیوانۂ ۔۔۔ از حیاتِ خود نما بیگانۂ
آبِ من منقارِ مرغاں بشکند ۔۔۔ آدمی را گوہرِ جاں بشکند

اسرار ۶۱

پرندہ حسرت سے ایک ٹہنی پر جا بیٹھا۔ اتنے میں اُسے ایک قطرۂ شبنم نظر آیا جو چشمِ بلبل میں اشک کی مانند سورج کی روشنی میں اپنی ہستی کے مٹ جانے کے خوف سے شاخِ گل پر کانپ رہا تھا۔ اُس کی کمزوری نے پرندے کو قوت بخشی اور قطرہ آن کی آن میں اپنی ہستی کو مٹا بیٹھا۔ علامہ اقبال پوچھتے ہیں کہ تم قطرہ ہو یا گوہر؟ ؎

از تو پرسم قطرۂ یا گوہری؟
چوں ز سوزِ تشنگی طائر گداخت ۔۔۔ از حیاتِ دیگرے سرمایہ ساخت
قطرہ سخت اندام و گوہر خو نبود ۔۔۔ ریزۂ الماس بود و او نبود
غافل از حفظِ خودی یک دم مشو ۔۔۔ ریزۂ الماس شو شبنم مشو
پختہ فطرت صورتِ کہسار باش ۔۔۔ حاملِ صد ابرِ دریا بار باش
خویش را دریاب از ایجابِ خویش ۔۔۔ سیم شو از بستنِ سیمابِ خویش
نغمۂ پیدا کن از تارِ خودی

آشکارا ساز اسرارِ خودی   اسرار ۶۲

نفی خودی سے بے ہمتی پیدا ہوتی ہے اور قوائے عمل مفلوج ہو جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے ایک حکایت سے ذہن نشین کرایا ہے۔ کہ ایک سبزہ زار میں چند بھیڑیں بڑے آرام سے زندگی بسر کرتی تھیں کہ کسی شیر کی توجہ اس طرف ہو گئی اور اس نے بھیڑوں کو ہلاک کرنا شروع کیا۔ ایک عقلمند بھیڑ نے خیال کیا کہ یا تو اپنی برادری کو ہمت دلا کر شیر بنائے یا شیر کو نفی خودی کی تعلیم سے بھیڑ بنا دے۔ آخری صورت اُسے زیادہ آسان معلوم ہوئی۔ کیونکہ ؎

نیست ممکن کز کمالِ وعظ بند   خوئے گرگی آفریند گوسفند

شیرِ نر را میش کردن ممکن است   غافلش از خویش کردن ممکن است

اسرار ۳۱

چنانچہ وہ متبرک صورت بنا کر مرسل یزداں کے لباس میں شیر کے پاس گئی اور اُسے ناپائداریٔ دنیا اور نفیٔ خودی کی تعلیم دی غربت و تنگدستی کو نعمت بتایا اور جنت صرف ضعیفوں کا حق قرار دیا اور بتایا کہ سبزہ پامال ہونے سے ہی بار بار اُگ آتا ہے ؎

مایہ دار از قوّت روحانیم   بہر شیراں مرسل یزدانیم

توبہ از اعمالِ نامحمود کن   اے زیاں اندیش فکرِ سود کن

ہر کہ باشد تند و زور آور شقی است   زندگی مستحکم از نفی خودی است

جنت از بہرِ ضعیفاں است و بس | قوت از اسبابِ خسران است و بس
جستجوئے عظمت و سطوت شر است | تنگدستی از امارت خوشتر است
فتنہ شو صحرا مشو گر عاقلی! | تاز نورِ آفتابے بہرہ خوری
اے کہ می نازی بذبح گوسفند | ذبح کن خود را کہ باشی ارجمند
سبزہ پامال است و روید بار بار | خوابِ مرگ از دیدہ شوید بار بار

غافل از خود شو اگر فرزانۂ
گر ز خود غافل نۂ دیوانۂ — اسرار ۲۲

اس پند خواب آور سے شیر نا اہل ہو گیا۔ جسے[1] کہ اس کی طاقت جواب دینے لگی اور دینِ گوسفندی نے اس میں انحطاط کے تمام آثار پیدا کر دئے ؎

شیر بیدار از فسونِ میش خفت | انحطاطِ خویش را تہذیب گفت
اسرار ۲۳

جرمِ ضعیفی کی سزا ازل سے مرگِ مفاجات ہے ؎
کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی[1]

پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات

---

[1] عربی زبان کا مشہور شاعر۔ نام احمد۔ ۲۷ ربیع الاول ۳۶۳ھ کو ملک شام کے شہر معرہ میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر میں چیچک کی وجہ سے آنکھیں جاتی رہیں۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ ان کی بہت سی تصانیف مشہور ہیں۔ رسالۃ الغفران ان کی ایک مشہور کتاب ہے۔

اک دوست نے بھونا ہُوا تیتر اُسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ تر و تازہ معرّی نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات
اے مرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات؟
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

بالِ جبریل ۲۰۹

مسلم قوم کے احیاء کے لیے دلِ مردہ کو دوبارہ زندہ کرنا ضروری ہے۔ قوم کے بحرِ پُرسکون میں طوفان و نہنگ کی آمد کی اشد ضرورت ہے۔

دلِ مردہ دل نہیں ہے اِسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمّتوں کے مرضِ کہن کا چارہ
ترا بحر پُرسکوں ہے، یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابیِ کنارہ!
تو ضمیرِ آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے

نہیں ہے قرار کرتا تجھے غمزۂ ستارہ
ترے نیستاں میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے
مری خاک پے بسپر میں جو نہاں تھا اک شرارہ
ضربِ کلیم ۳۱

اقبال حسن و آرٹ میں بھی دلبری کی بجائے قاہری پسند کرتا ہے

دلبری بے قاہری جادوگری است دلبری با قاہری پیغمبری است
زبورِ عجم ۲۶۴

آرٹ کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اس سے خودی کی تربیت ہو اور خود اعتمادی و قوّت یقین پیدا ہو۔ اُن کے خیال میں تمام علوم و فنون کو مقصدِ حیات کے تابع ہونا چاہیئے۔ بہترین فن وہ ہے۔ جو ہمیں کارزارِ حیات میں حقیقت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بخشے اور اس کے لیے ہمیں تیار کرے۔ ادب اور فنونِ لطیفہ جو زندگی کے حقائق سے غافل اور عمل سے بیگانہ کریں۔ کسی طرح قابلِ تعریف نہیں ہے

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں اِن کی گرہ میں تمام یکدانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ
ضربِ کلیم ۹۸

وہ ان شاعروں سے بیزار ہیں جن کے اعصاب پر ہر دم عورت سوار رہتی ہے۔ اور جن کا پیغام ذوقِ حیات سے محروم کرنے والا ہو ان کا نغمہ و شعر اس سانپ کی مانند ہے۔ جو پھولوں کے ڈھیر کے نیچے چھپا ہوا ہو ؎

وائے قومے کز اجل گیرد برات | شاعرش وا بوسد از ذوقِ حیات
بوسۂ او تازگی از گل برد | ذوقِ پرواز از دلِ بلبل برد
سستِ اعصاب تو از افیونِ او | زندگانی قیمتِ مضمونِ او
در یمِ اندیشہ اندازد ترا | از عمل بیگانہ می سازد ترا
جوئے برقے نیست در نیسانِ او | یک سرابِ رنگ و بو بستانِ او
قلبِ مسموم از سرود بلبلش | خفتہ مارے زیرِ انبارِ گلش

از خم و مینا و جامش الحذر
از مئے آئینہ فامش الحذر
اسرار ۳۹۔ ۴۰

وہ ادب میں فکرِ صالح پیدا کرنا چاہتے تھے اور شعر کا مقصود آدم گری سمجھتے تھے ؎

شعر را مقصود اگر آدم گری است | شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

جاوید نامہ ۴۶

ان کے خیال میں شعر کو حیاتِ ابدی کے پیغام کا حامل ہونا چاہیئے ایسے شعر کے متعلق لکھا ہے ؎

صد نالۂ شبگیرے، صد صبح بلا خیزے | صد آہِ شرر ریزے یک شعرِ دلآویزے

فن کا اہم فریضہ سوسائٹی کی ترقی ہے۔ وہ لوگ جو آرٹ کو آرٹ کی خاطر، کہنے کے عادی ہیں۔ دراصل زندگی کی عملی کشمکش سے بھاگ کر ادب میں پناہ ڈھونڈنے والے ہیں۔ ایسا فن روح کو خوابیدہ اور جسم کو بیدار کرتا ہے اور مخرب اخلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نظریہ کو قبول کرنے والوں کی رہبری کے لیے اُن کے اپنے معیار کے ماسوا اخلاق یا مذہب کا کوئی اور اصول قابلِ تقلید نہیں ہوتا۔ اس طرح عُریانی کو بھی فن تصوّر کرکے قابلِ ستائش قرار دیا جاتا ہے۔ ایسے فن کی ایک اور صورت یورپ کا رقصِ بدن ہے۔ جس سے کام و دہن کی تشنگی بڑھتی ہے۔ اُس کی جگہ علامہ اقبال رُوح کی اُس بیداری کے متمنی ہیں جو افلاک کو بھی برہم کرسکتی ہے ؎

چھوڑ یورپ کے لیے رقص بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللّٰہی!
صلہ اُس رقص کا ہے تشنگیٔ کام و دہن
صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی

ضرب کلیم ۱۳۵

رقص تن در گردش آرد خاک را
رقصِ جان برہم زند افلاک را
علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست

ہم زمیں ہم آسماں آیہ باہرست

جاوید نامہ ۲۴۵

ذوقِ نظر وہی کارآمد ہے جو ہر شے کی حقیقت کو دیکھے اور سوزِ حیاتِ ابدی سے روشناس کرا سکے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

ضربِ کلیم ۱۱۷

مسلمانوں کی عمارتوں میں بھی اقبال کو وہ زیادہ پسند تھیں جو کمالِ فن کے ساتھ قوت الاسلام کا پیغام رکھتی ہیں جلال کے بغیر حسن و جمال بے معنی ہے۔

مری نظر میں یہی ہے جمال زیبائی
کہ سربسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک!
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

ضربِ کلیم ۱۲۲

حسن اور قوت کا توازن ضروری ہے ۔ اقبال عمارتوں میں بیگمانی حسن دیکھنے کا خواہاں نہیں اقبال نے آزاد و غلام قوموں کی موسیقی و تعمیرات کا مقابلہ کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ غلاموں کا فن بھی ان کی ذہنیت کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ اندلس کی اسلامی عمارتوں کی مثال دیتے ہوئے آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ "ان میں ایک خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے ۔ لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قوا، شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں بھی ضعف آتا گیا ۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا ۔ (۱) قصرِ زہرا جو دیوؤں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے (۲) مسجد قرطبہ ۔ مہذب دیوؤں کا کام (۳) الحمرا ۔ صرف مہذب انسانوں کا ہے ۔[1]

علامہ اقبال کو یورپ سے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق ہوا ۔ جہاں انہوں نے قدیم فرعونوں کے مقابر دیکھے ۔ ان قبروں کے ساتھ مدفون بادشاہوں کے بُت بھی تھے ۔ اُن کے متعلق فرمایا کہ "اُن میں قوت ذہنیت کی ایک ایسی شان تھی جس سے میں بہت متاثر ہوا ۔ قوت کا یہی احساس حضرت عمرؓ کی مسجد قوۃ الاسلام بھی پیدا کرتی ہے"[2] مسجد قوت الاسلام کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ؎

ہے تری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز

جس کی تکبیر میں ہو معرکۂ بود و نبود

---

[1] ملفوظات اقبال نامہ صفحہ ۱۲۵ [2] ملفوظات اقبال صفحہ ۱۲۶

ہے مری بانگ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ
کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود

ضربِ کلیم ۱۰۳

تاج محل کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں مسجد قوۃ الاسلام کی کیفیت نظر نہیں آتی۔ بعد کی عمارتوں کی طرح اس میں بھی قوت کے عنصر کو ضعف آگیا ہے۔ دراصل قوت کا عنصر ہی ہے جو حسن کے لیے توازن قائم کرتا ہے[1]

قوت اور حسن کا توازن قرآنی نظریہ کے عین مطابق ہے اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ کو فرعون کے پاس جاکر نرمی سے بات کرنے کی ہدایت فرمائی لیکن اس کے ساتھ ہی عصا بھی عطا کیا کہ اگر نرمی سے کام نہ چلے تو ضربِ کلیمی کا استعمال کیا جائے۔ کیونکہ ع

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد بالِ جبریل ۱۰۲

ہندو ادب اور آرٹ میں قوت کا عنصر بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مذہب انھیں سکون کی تلاش سکھاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے

---

[1] اقبال کے اس نظریہ پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالواحد نے ملفوظات میں تجویز کی ہے کہ اقبال کے مقبرہ کی تعمیر کا کام کسی ایسے ماہرفن کے سپرد کرنا چاہیئے جس نے اقبال کے کلام کا مطالعہ کیا ہو اور جو ان کی شخصیت کے عین مطابق مقبرہ میں بھی رفعت وجبروت پیدا کرسکے۔ لیکن اس طرف مناسب توجہ نہیں دی گئی

[2] ملفوظات اقبال صفحہ ۱۲۶

اُنھوں نے موسیقی میں کافی ترقی کی ہے لیکن مسلمان کی اساس بالکل مختلف چیزوں پر ہے اس کے لیے موسیقی یا بلبل، قمری اور طاؤس کے افسانے بے معنی ہیں ؎

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

بال جبریل ۱۱۰

مسلمان کے لیے آبجو کی پرسکون روانی نامناسب ہے وہ فوارہ کی زور دروں سے پیدا ہونے والی بلندی کا طالب ہے ؎

یہ آبجو کی روانی یہ ہم کناری خاک
مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ
ادھر نہ دیکھ اُدھر دیکھ اے جوان عزیز
بلند زور دروں سے ہوا ہے فوارہ

ضرب کلیم ۱۲۵

اس کا دریا طوفانی ہے ؎

اُونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا!
جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان

ضرب کلیم ۱۷۱

مسلمان کو مخاطب کرتے ہوئے علامہ مرحوم لکھتے ہیں ؎

میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی
بانگ درا ۳۰۸

شہباز و شاہین سختیاں برداشت کرکے بلند مقام حاصل کرتے ہیں۔ لیکن زاغ و زغن آرام کے متوالے ہیں۔ اُن میں بلند پروازی پیدا نہیں ہوتی ؎

"شہپرِ زاغ و زغن دربندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند" بانگِ درا ۲۸۶

کرگس کی دوں ہمتی اور شاہین کی بلند پروازی کا مقابلہ کیا ہے ؎
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہان اور
بال جبریل ۲۰۸

پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکارِ زندہ کی لذّت سے بے نصیب رہا
بال جبریل ۲۱۰

رزقِ زاغ و کرگس اندر خاکِ گور
رزقِ بازاں در سوادِ ماہ و مہر جاوید نامہ ۲۳۹

علامہ اقبال کے کلام میں "شاہین" وغیرہ کے الفاظ سے بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے یہ اثر مغربی ادب سے قبول کیا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی انھوں نے اسلامی رنگ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ شاہین کی نسبت آپ نے خود تحریر کیا کہ "شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں:-

۱۔ خود دار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔

۲۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔

۳۔ بلند پرواز ہے۔

۴۔ خلوت نشین ہے۔

۵۔ تیز نگاہ ہے" [1]

بال جبریل میں "شاہین" پر ان کی نظم بھی انہی خیالات کی آئینہ دار ہے :

کیا میں نے اُس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
نہ بادِ بہاری نہ گلچیں نہ بلبل
نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ

[1] مولوی ظفر احمد صدیقی کے نام علامہ اقبال کا مکتوب۔ اقبال نامہ صفحہ ۲۰۵

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ بال جبریل ۲۱۹

پند باز میں بھی علامہ مرحوم نے ان صفات کا ذکر کیا ہے ؎

تو رانی کہ بازاں زیک جوہر اند	دل شیر دارند و مشت پراند
نکو شیوہ و پختہ تدبیر باش	جسور و غیور و کلاں گیر باش
نگہ دار خود را و خورسند زی	دلیر و درشت و تنومند زی
چہ خوش گفت فرزند خود را عقاب	کہ یک قطرہ خوں بہتر از لعل ناب
چنیں یاد دارم ز بازان پیر	نشیمن بشاخ درختے مگیر
کنامے نگیریم در باغ و کشت	کہ داریم در کوہ و صحرا بہشت
ز روئے زمیں دانہ چیدن خطاست	کہ پہنائے گردوں خدا داد ماست
بپئے شاہبازاں بساط است سنگ	کہ بر سنگ رفتن کند تیز چنگ

ندست کسے طعمۂ خود مگیر
نکو باش و پند نکویاں پذیر پیام مشرق ۱۱۷-۱۱۹

اقبال اُس طائرِ لاہوتی کو پسند کرتا ہے جو پرواز میں کوتاہی پیدا کرنے والے رزق پر موت کو ترجیح دیتا ہے ؎

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

بالِ جبریل ۸۴

سخت کوشی کی تعلیم یوں دی ہے ؎

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سال خورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں!
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں!
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

بالِ جبریل ۱۶۴

نوجوانوں میں عقابی روح بیدار کرنے کی ضرورت ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر

تو شاہیں ہے! بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

بال جبریل ۱۹۲

نومیدی کو ہٹا کر انسان اپنے عمل اور عملی قوتوں پر یقین رکھے تو بے پناہ طاقت کا مالک بن سکتا ہے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں! یقین سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

بال جبریل ۸۷

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

بانگ درا ۳۰۸

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

بانگ درا ۳۱۱

اسلامی نظام انسان کی عملی قوتوں کو اجاگر کرتا ہے اور ہر اس فعل کو جو عمل سے بیگانہ کرے۔ ناپسند کرتا ہے۔ عمل سعی اور جدوجہد کے بغیر کسی چیز کے حصول کی تمنا انسانی پیدائش کی اصل غرض و غایت اور مصلحت الٰہی کے بالکل خلاف ہے۔ شیطان نے آدم کو حیات جاوید اور غیر فانی بادشاہت اسی طریق پر دلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے پسند نہ فرمایا۔ اسی وجہ

سے اسلام میں گدائی و سوال کی مذمت کی گئی ہے۔ غیر مستحق لوگوں کو صدقہ و خیرات لینے کی بھی ممانعت ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص لکڑیوں کا گٹھا اپنی پیٹھ پر اٹھا لائے اور اس کو بازار میں بیچے تو خدا اس کی عزت رکھ لیتا ہے اُس کے لیے یہ محنت اس سے کئی درجے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے مانگتا پھرے آپ نے روزی کمانے والے کی تعریف کی :-

الکاسب حبیب اللہ - علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

آنکہ خاشاکِ بتاں از کعبہ رُفت	مرد کاسب را حبیب اللہ گفت
وائے بر منت پذیرِ خوانِ غیر	گردنش خم گشتۂ احسانِ غیر
خویش را از برقِ لطفِ غیر سوخت	با پشیزے[1] مایۂ غیرت فروخت

اسرار ۲۵

خودی سوال سے ضعیف ہوتی ہے اور مانگنے والا سوال سے اور نادار ہوتا ہے غیرت مردانہ کا تقاضا تو یہ ہے کہ انسان بحر حیات میں نگوں پیمانہ رہے اور پیاسا ہوتے ہوئے خضر سے دست سوال دراز نہ کرے ؎

از سوال افلاس گردد خوار تر	از گدائی گدیہ گر نادار تر
از سوال آشفتہ اجزائے خودی	بے تجلی نخلِ سینائے خودی
رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو	موجِ آب از چشمۂ خاور مجو
اے خنک آں تشنہ کاندر آفتاب	می نخواہد از خضر یک جامِ آب

[1] پشیز - کوڑی

ترجبیں از خجلتِ سائل نشد شکل آدم ماند دستِ گل نشد

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش

ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش اسرار ۲۵-۲۶

چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے لیکن ؎

ماہ را روزی رسد از خوانِ مہر داغ بر دل دارد از احسانِ مہر

اسرار ۲۵

طور پر دریوزہ گری کی نسبت اپنی ہستی سے شعلۂ سینائی پیدا کرنا بہتر ہے ؎

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم!

اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

بانگ درا ۲۱۹

عمل یا جادۂ حیات میں کسی کا سہارا ڈھونڈنا بھی سوال میں شامل ہے۔ کیونکہ اس سے عملی قوتیں کمزور ہوتی ہیں ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہِ دیگراں رفتن عذاب است

پیامِ مشرق ۶۲

حضرت عمرؓ اونٹ پر تشریف لے جا رہے تھے۔ کہ تازیانہ ہاتھ سے گر گیا۔ آپ نے کسی دوسرے کو اٹھانے کے لیے نہ فرمایا بلکہ خود اُتر کر اُٹھا لیا ؎

خود فرود آ از شتر مثلِ عمرؓ الحذر از منتِ غیر الحذر

اسرار ۲۴

باپ کی میراث بھی عمل سے عاری کرے تو مسرت کا مقام نہیں ؎

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی
کجا عیش بروں آوردنِ لعلے کہ در سنگ است

زبورِ عجم ۱۸۲

اسی لیے کہا ہے ؎

مور بیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مور بے پر! حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

بانگِ درا ۳۰۱

تحریکِ خلافت کے زمانہ میں خلافت کمیٹی نے ایک وفد اس مقصد کے لیے تیار کیا کہ وہ لندن جاکر برطانیہ سے ترکی خلافت کی بحالی کی درخواست کرے۔ علامہ اقبال نے یہ شعر لکھ کر ممبرانِ وفد کو بھیج دئے ؎

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چناں عار ناید

کہ از دیگراں خواستن مومیائی"

بانگ درا ۲۸۶

مندرجہ بالا بحث سے ہم اقبال کا نظریہ خیر و شر معلوم کر سکتے ہیں۔ اُس کے نزدیک وہ عمل جو خودی کو مستحکم کریں، زندگی کو فروغ دیں اور انسان کو اس کے مقصدِ حیات میں کامیاب کر کے صحیح طور پر نیابت الٰہی کا حق دار بنائیں، اعمال صالح ہیں اور وہ عمل جو خودی کو کمزور کریں اور کمزوری کی تمام متعلقہ برائیوں کو پیدا کریں، شر کا حکم رکھتے ہیں۔ یہاں ایک غلط فہمی کے پیدا ہونے کا احتمال ہے کہ اقبال نے خودی کو مستحکم کرنے کے لیے ہر جگہ سخت کوشی کی ایسی تعلیم دی ہے۔ جو انسان کو درندگی کی طرف لے جانے والی ہے اور جسمانی قوت کو منتہائے کمال قرار دے کر جنگی جذبہ کو فروغ دینے والی ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ علامہ اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے ایک خط میں خود اس کی تردید کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"مسٹر ڈکنسن کے نزدیک میں نے اپنی نظموں میں جسمانی قوت کو منتہائے کمال قرار دیا ہے۔ انھوں نے مجھے ایک مکتوب لکھا ہے جس میں یہی خیال کیا ہے انھیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں۔ لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا جب ایک قوم کو صداقت کی حمایت میں دعوت پیکار دی جاتے تو میرے

عقیدے کی رُو سے اُس دعوت پر لبیک کہنا اُس کا فرض ہے لیکن میں اُن تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو۔"[1]

اقبال نے اسی قسم کی تردید مولوی ظفر احمد صدیقی کے نام ایک خط میں بھی کی جس میں آپ نے لکھا کہ "میں جنگ کا حامی نہیں ہوں۔ نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدودِ معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے قرآن کی تعلیم کی رو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اُس صورت میں جب مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے مسلمان کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے (نہ حکم) دوسری صورت جس میں جہاد کا حکم ہے ۴۹/۹ میں بیان ہوئی ہے[2] جنگ کی

۱؎ اقبال نامہ صفحہ ۴۶۰

۲؎ پوری آیت یوں ہے:۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ	اگر مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو پھر اگر ان میں کا ایک فرقہ دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے تم اُس سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مذکورہ بالا دو صورتوں کے سوائے میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ جوع الارض کی تسکین کے لیے جنگ کرنا دینِ اسلام میں حرام ہے" [1]

ملت کی بقا کے لیے جنگ ضروری ہے۔ اسی لیے اسلام نے جہاد کو افضل العبادت قرار دیا جہاد کے بغیر دین کی حفاظت ممکن اور جہاد ایمان کی ایسی کسوٹی ہے۔ جس پر سچے اور جھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے:۔

عَفَا اللّٰہُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ	(اے پیغمبر) خدا تمھیں معاف کرے تم نے اُن کو پیچھے رہ جانے کی اجازت ہی کیوں دی تھی۔ اس وقت تک انتظار کیا ہوتا کہ سچے اور جھوٹے کی تمیز ہو جاتی۔ اے پیغمبر جو لوگ خدا کا اور

فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰہَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ $\frac{۴۹}{۹}$	(بقیہ صفحہ ۳۴۶) رجوع کرے اور جب ایسا کرے تو فریقین میں برابری کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کو ملحوظ رکھو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

[1] اقبال نامہ صفحہ ۲۰۴

یُجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ ۝ اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ -	روزِ آخرت کا یقین رکھتے ہیں وہ تو تم سے اس بات کی رخصت مانگتے نہیں کہ اپنی جان و مال سے شریکِ جہاد نہ ہوں اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے تم سے اجازت کے خواہاں وہی لوگ ہوتے ہیں۔ جو اللہ اور روزِ آخرت کا یقین نہیں رکھتے۔

۹/۴۴-۴۵

لیکن جہاد کا فی سبیل اللہ ہونا ضروری ہے - گو جہاد میں کامیابی حاصل ہونے سے سلطنت میں اضافہ ہوگا۔ لیکن ملکی فتوحات یا نفسانی اغراض کے لیےؔ لڑائی کرنا جہاد نہیں ہے - ایماندار لوگ صرف خدا کی راہ میں لڑتے ہیں :-

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ ۴/۷۶	جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو لوگ کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔

ؔ حضرت علی ایک لڑائی میں ایک کافر پر غالب آئے اور اُسے تلوار مارنے لگے کہ اُس نے آپ کے چہرہ پر تھوک دیا۔ آپ نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ کیونکہ اُس کے قتل میں اب نفسانی غرض کا شائبہ ہو گیا تھا۔

اگر مقصود بدل جائے تو وجہ فساد بن جاتا ہے

صلح شر گردد چو مقصود است غیر
گر خدا باشد غرض جنگ است خیر
گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند
جنگ باشد قوم را نا ارجمند
ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغ او در سینہ او آرمید
اسرار ۷۰، ۲

رسول اکرمؐ نے لڑائیوں میں چند صفوں کو اس لیے کاٹا کہ باقی انسانیت اُن کی شر سے محفوظ ہو۔ آپ نے چند گردنیں اس لیے کاٹیں کہ باقی دنیا کی گردنیں استعمار سے آزاد ہو سکیں اسلام نے ہر غیر خدائی نظام کو اس لیے توڑا کہ اس سے جدید اور صحیح تمدن کی تعمیر کرے۔ قیصر و کسریٰ کی دولت کو اس لیے قبضہ میں کیا تاکہ اُسے عوام تک پہنچا سکے۔

جب جہاد ضروری ہو اور ملت کا بقا خطرے میں ہو۔ تو ہر مومن کے لیے آرام و آسائش کو چھوڑ دینا ضروری ہے۔ جہاد خواہ جان سے ہو یا مال سے اللہ کے نزدیک مستحسن ہے۔

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللَّهُ	مسلمانوں میں سے بیٹھے رہنے والے سوائے اُن کے جو معذور ہوں اور وہ لوگ جو خدا کے راستہ میں اموال و نفوس سے جہاد کرتے ہیں۔ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

اور (یوں) خدا کا وعدہ نیک تو سب ہی (مسلمانوں) سے ہے اور اللہ نے ثواب عظیم کے اعتبار سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پہ بڑی برتری دی ہے۔ یہ مدارج ہیں جو خدا کے ہاں سے ہیں اور اس کی بخشش و رحمت ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔	الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۧ ۹۵-۹۶ / ۴

وہ لوگ جو جہاد میں مارے جائیں۔ شہید ہیں۔ شہدا کے درجہ کے متعلق علامہ اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے ؎

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی۔
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

بانگ درا ۲۱۹

قرآن کریم نے اللہ تعالےٰ کی راہ میں جان دینے والوں کے متعلق یوں فرمایا:۔

جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں انہیں مردہ مت کہو بلکہ زندہ ہیں ۔	وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ

لَا تَشْعُرُوْنَ ۔ ۱۵۴ | لیکن تم نہیں سمجھتے ۔

علامہ اقبال نے جنگ طرابلس کی ایک عرب لڑکی کا ذکر کیا ہے ۔ جو غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی ۔ ایسے افراد ملت کی آبرو ہیں ؎

فاطمہ ! تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

اُس کی موت میں بھی زندگی ہے اور اس کی تربتِ خاموش حیات قومی کے ہنگاموں سے بارونق ہے ؎

فاطمہ ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

بانگ درا ۲۲۹

جاوید نامہ میں علامہ اقبال نے سلطان ٹیپو شہید کا تذکرہ کیا ہے جن کا نام شہادت کی وجہ سے مہرِ خورشید سے تابندہ تر ہے ۔ اُن کا فقر جذبۂ حسینی کا وارث ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی قبر کی خاک بھی زندہ انسانوں سے زندہ تر ہے اور دکن میں اب تک اُن کے نام کی نوبت بج رہی ہے ؎

آں شہیدانِ محبت را امام آبروئے ہند و چین و روم و شام

تابش از خورشید و مہ تابندہ تر	خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر
عشق رازے بود بر صحرا نہاد	تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد
از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین	فقر سلطاں وارثِ جذبِ حسین

رفت سلطان زیں سرائے ہفت روز

نوبت او در دکن باقی ہنوز

فلسفۂ جنگ و شہادت کے اسلامی نظریہ کی تشریح کرتے ہوئے علامہ مرحوم لکھتے ہیں کہ مومن خدا تعالےٰ سے ایسی موت کی تمنا کرتا ہے جو اُسے عالمِ مادی سے بلند کر دیتی ہے اور جو حضرت علیؓ کے بیٹے سید الشہدا حضرت امام حسینؓ کو نصیب ہوئی۔ جنگ مومن سنّت پیغمبری ہے جو اسلام کی حمایت میں اور اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کے لیے کی جاتی ہے۔ مسلمان کا ترک عالم جہاد میں ہے۔ اَلْجِہَادُ رہبانیۃُ الاسلام۔ مومن جب جنگ کرتا ہے تو دنیا کی دلچسپیوں کو چھوڑ کر اپنے محبوب کی طرف رُخ کرتا ہے ؎

مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک	آں دگر مرگے کہ برگیرد زخاک
آں دگر مرگ! انتہائے راہِ شوق	آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر!	مرگِ پور مرتضیٰؓ چیزے دگر
جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است	جنگِ مومن سنّتِ پیغمبری است
جنگِ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست	ترکِ عالم، اختیارِ کوئے دوست
آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت	جنگ را رہبانیٔ اسلام گفت

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

جاوید نامہ ۲۱۸

ملت اسلامیہ دشمنوں کے مقابلہ میں سخت گیر ہے۔ جب کفار سے مقابلہ ہو تو ان کے لیے پیٹھ پھیرنا عذاب خداوندی کو دعوت دینا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَۚ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔

۵
۱۶-۱۵

اے ایمان والو جب تم کفار سے مد مقابل ہو جاؤ تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا اور جو شخص ان سے اس وقت پیٹھ پھیر گیا۔ سوائے اس کے جو لڑائی کے لیے پینترا بدلے یا اپنی جماعت کی طرف پناہ لینے آئے تو اللہ کے غضب کا مستحق ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہو گا جو رہنے کے لیے بہت بری جگہ ہے۔

اقبال ایسی ہی انسانیت کا علمبردار ہے جو طاغوت کے مقابلہ میں سخت ہے ؎

در رہ دیں سخت چوں الماس زی
دل بحق بر بند و بے وسواس زی

جاوید نامہ ۲۲۰

اللہ تعالےٰ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ جو دین کی حفاظت میں سیسہ پگھلائی دیوار کی طرح جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں ؎

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

پیام مشرق ۱۰۸

کیونکہ ؎

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

ارمغان حجاز ۲۵۳

لیکن مومن کے ایک گوشہ میں دلِ درد آشنا بھی ہوتا ہے ؎

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے — تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلِ درد آشنائے — چو جوئے در کنارِ کوہسارے

پیام مشرق ۱۸

اس کی تعریف اللہ تعالےٰ نے یوں فرمائی ہے:

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ — مومن کفار کے مقابلہ میں سخت اور
رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۔ $\frac{48}{29}$ — آپس میں رحم دل ہیں۔

علامہ اقبال نے مومن کی یہ صفت بیان کی ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ضربِ کلیم ۶۱

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

بانگ درا ۳۱۲

نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم مسلمانوں کو باہمی ہمدردی، محبت و شفقت میں اس طرح پاؤ گے۔ جیسے ایک جاندار جسم ہوتا ہے کہ جب اس کے ایک عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو تمام بدن بے چینی اور بیماری میں اس کا ساتھ دیتا ہے ؎

فطرتِ مسلم سراپا شفقت است ۔۔۔ در جہاں دست و زبانش رحمت است
آنکہ مہتاب از سرِ انگشتش دو نیم ۔۔۔ رحمتِ او عام و اخلاقش عظیم
از مقامِ او اگر دور ایستی ۔۔۔ از میانِ معشرِ[1] ما نیستی

رموز ۱۵۲

مومن شبنم بھی ہے اور طوفان بھی ؎
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ضربِ کلیم ۵۰

---

[1] معشر۔ گروہ : جماعت۔

مسلمان باطل کے لیے تلوار اور حق کی حفاظت میں سپر ہے
بزم میں وہ دل افروز ساز کی طرح لیکن رزم میں آہن گداز تلوار سے
کم نہیں ؎

اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزال تاتاری

ضربِ کلیم ۱۲۷

وہ گلستان میں بلبلوں کا ہم صفیر لیکن بیابان میں زبردست
صیاد ہے ؎

پیش باطل تیغ و پیش حق سپر
امر و نہی او عیار خیر و شر
سازِ او در بزم ہا خاطر نواز
سوزِ او در رزم ہا آہن گداز
در گلستان با عنادل ہم صفیر
در بیابان جرّہ باز صید گیر

رموز ۱۹۲

کائنات کی تلخ حقیقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمان سخت کوش
لیکن آپس میں رحم دل ہیں ۔ وہ رکوع اور سجدے میں اللہ کا فضل
اور اُس کی خوشی ڈھونڈتے ہیں ۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ	محمد خدا کے بھیجے ہوئے (پیغمبر) ہیں

مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ز سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط	اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں کافروں کے حق میں بڑے سخت ہیں۔ مگر آپس میں رحم دل۔ تو اُن کو دیکھے گا کہ (کبھی) رکوع کر رہے ہیں اور کبھی سجدہ اور خدا کے فضل اور خوشنودی کو ڈھونڈتے ہیں۔ ان کی شناخت یہ ہے کہ ان کی پیشانیوں پر سجدے کے نشان ہیں۔

۴۸/۲۹

دُنیا کو معلوم ہے کہ ایسے ہی لوگوں نے اسلام کو سر بلند کیا اور فتح و نصرت نے ہر جگہ اُن کے قدم چومے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

بانگِ درا ۳۱۰

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

مسلم حنیف جذبات متناقض یعنی قہر و محبت کو اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے[1] اور اس طرح زمان و مکان کی تسخیر میں آگے بڑھتے چلا جاتا ہے۔ وہ تیغِ خودی کو کلمہ طیبہ لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ کی فسان پر تیز کرتا ہے۔ تخلیقِ آدم کا مقصد سمجھتا ہے اور اپنی قوتوں سے بھی آشنا ہوتا ہے آخر کار وہ اپنی ہستی کو اس قابل بنا دیتا ہے

[1] اقبال نامہ صفحہ ۱۵

کہ دنیا اُس کے گرد گھومنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ نطشے نے درست لکھا ہے کہ "دنیا صرف اُن لوگوں کے گرد گھومتی اور طواف کرتی ہے جو اپنے اندر تخلیقی اور ایجادی قوتیں رکھتے ہوں۔ اگرچہ اس کا اس طرح پر گھومنا ہمیں نہ بھی دکھائی دیتا ہو"

اس جہاں میں نقدِ مومن کی پڑتال کی جاتی ہے۔ اگر انسان اُس پر مسلط نہ ہو سکے۔ تو وہ انسان کو پکڑے رکھتا ہے اس طرح جیسے سبو میں مے ہے

کارواں را رہگذر است ایں جہاں   نقدِ مومن را عیار است ایں جہاں
گیر او را تا نہ او گیرد ترا   ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا

مسلمان کے لیے سخنِ محمدی کافی ہے۔ اس کی خودی اگر قائم ہو تو اُسے مغرب کے کسی فلسفی یا حکیم کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں رہتی ہے

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا   زناریٔ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی   ہے اس کا طلسم سب خیالی
دیں مسلکِ زندگی کی تقویم   دین سرِّ محمدؐ و براہیمؑ!
دل در سخنِ محمدی بند   اے پورِ علیؓ زبو علیؒ چند
چوں دیدۂ راہ بیں نداری
قائد قرشی[1] بہ از بخاری[1] ضربِ کلیم ۱۱

[1] قرشی سے مراد حضور رسالت مآب ہیں اور بخاری سے بوعلی سینا۔ اقبال نامہ صفحہ ۱۴۱

جب خودی کی موت ہو جائے تو جذبِ دروں جاتا رہتا ہے اور افراد پر قفس حلال اور آشیانہ حرام ہو جاتا ہے ؎

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام

خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام!

ضرب کلیم ۷۹

علامہ اقبال نے ہندی مسلمانوں کو مخاطب کر کے طنز کی ہے کہ پاکانِ حرم اور اربابِ ہمم کی بہشت کے علاوہ ایک بہشت فی سبیل اللہ بھی ہے جس کی اُمید عمل سے بے بہرہ مسلمان رکھ سکتے ہیں جو حضورؐ کے اس ارشاد سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں :۔

مَنْ تَرَكَ سُنَّتِيْ لَمْ يَنَلْ شَفَاعَتِيْ — جس شخص نے میری سنت کو ترک کیا اُسے میری شفاعت نہیں پہنچے گی ۔

وہ رسول اکرمؐ کی شفاعت کی آس پہ گناہ پر گناہ کیے جا رہے ہیں ؎

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

ارمغانِ حجاز ۲۱۰

اسلام شفاعت کو تسلیم کرتا ہے اور یہ ہمارا ایمان ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے شفیع ہیں۔ لیکن اسلامی شفاعت کے اثبات کی بنیاد دو اصولوں پر ہے :-

۱۔ مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ[1] جسے اللہ تعالےٰ اذن دے
۷۸/۳۸

اس قول ربانی کا عملی پہلو آنحضرت صلعم کے اس ارشاد میں ملتا ہے کہ میں نے اپنی والدہ ماجدہ کے لیے استغفار کی اجازت طلب کی۔

---

[1] اس موضوع پر قرآن کریم سے تین حوالے درج کیے جاتے ہیں۔

یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ۔ ۲۰/۱۰۹	اس دن کسی کی سفارش کام نہ آئے گی بجز جس کو خدائے رحمٰن اجازت دے اور اس کا بولنا پسند فرمائے۔
مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۲/۲۵۵	کون ہے جو اس کے حکم کے بغیر اس سے سفارش کرے۔
يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ ۔ ۷۸/۳۸	قیامت کے دن جب جبرائیل اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہونگے کسی کے منہ سے بات نکلنے کی نہیں مگر جس کو خدائے رحمٰن اجازت دے

لیکن وہ نہیں ملی ۔ صرف اُن کی قبر کی زیارت کی اجازت ملی [1]

(۲)، وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ جو ٹھیک بات بیان کرے

ہر دو اصول بے عملی کی نفی کرنے والے ہیں ۔ اسلامی شفاعت کا کا اصول افراط و تفریط سے بچا ہوا ہے ۔ اس سے نہ تو انسان کو بے عملی کا سبق ملتا ہے اور نہ ہی کسی غلطی کے لیے اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معتوب کیا جاتا ہے ۔ اسلام توبہ کو تسلیم کرتا ہے ۔ لیکن قرآن کریم کی رُو سے توبہ کا مطلب یہ ہے کہ پہلے غلطی کا احساس ہو اور اس کے ساتھ عملی طور پر اصلاح بھی ہو :

مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ ﴿۵۴﴾ — جو کوئی تم میں سے بر راہ نادانی کوئی گناہ کر بیٹھے ۔ پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اپنی حالت کی اصلاح کرے تو خدا اُس کو بخش دے گا کیونکہ وہ بخشنے والا مہربان ہے ۔

اُن کی توبہ قبول نہیں ہوتی ۔ جو مرتے دم تک گناہ کرتے رہتے ہیں اور وقت نزع توبہ کرتے ہیں ۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰى — اور اُن لوگوں کی توبہ قبول نہیں جو (عمر بھر) بُرے کام کرتے رہے ۔

[1] سیرۃ النبی جلد چہارم صفحہ ۴۲۵ - ۴۲۹ معجزات کے بیان میں بھی باذن اللہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ۔

إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْئٰنَ ۴/۱۸	یہاں تک کہ ان میں سے جب کسی کے سامنے موت آکھڑی ہوئی تو لگے کہنے کہ اب میری توبہ

توبہ کا مدعا سابقہ عمل میں ایسا انقلاب پیدا کرنا ہے جو آئین کے مطابق ہو۔ اسلام ایسی توبہ سے واقف نہیں جو محض زبانی اقرار ہو۔

شفاعت کا غیر اسلامی تصوّر در اصل قدیم عربوں اور عیسائیوں کا پیدا کردہ ہے۔ جو خدا[1] اور انسان کے تعلق کو اس نسبت سے جانتے تھے جو ایک جابر بادشاہ کو اپنی رعایا سے ہوتی ہے اور جس تک پہنچنے کے لیے کسی درمیانی ہستی یا سفارشی کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے بتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کے جواز میں یہی کہتے تھے :-

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۱۰/۸	یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں

[1] رسول اکرمؐ نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ صرف قہار و جبار نہیں بلکہ رحمٰن اور رحیم بھی ہے۔ عدل و انصاف اس کا خاصہ ہے اور وہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا اسی لیے کہا گیا ہے۔

اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ ۔	ایمان کامل خوف (اللہ کا) اور امید کے درمیان ہے۔

مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى ؕ ۳۹/۳	ہم اُن کو اسی لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں قریب کر دیں۔

عیسائیوں نے حضرت عیسےؑ کی قربانی سے کفّارہ کا پہلو نکالا اور پوپ کو خدا اور بندے کے درمیان ایسی ہستی قرار دیا جو آسمانی بادشاہت کے دروازے حسب مرضی جس پر چاہے کھول سکتا ہے اور جس پر چاہے بند کر سکتا ہے۔ ایک عیسائی مورخ نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ مسلمان بخشش کے لیے کسی کلیسا یا پاپا کا محتاج نہیں۔

یہودیوں کا بھی یہ خیال تھا کہ وہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں اور اگر اُن پر کوئی مصیبت آبھی گئی تو اُن کے بزرگ اور برگزیدہ انھیں بچالیں گے۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں ان تمام عقائد کی الگ الگ اور واضح تردید کی[1] اور مسلمانوں کو عمل پیش کرنے کا صاف صاف

---

[1] عیسائیوں کے متعلق مائدہ ۱۶، توبہ ۵ میں۔ بت پرست عربوں کے عقیدہ کے متعلق یٰسین ۲، نجم ۲، زمر، انعام ۱۱۔ روم ۲ میں۔ اور یہود کے عقائد کی تردید بقرہ ۲، ۶ اور ۱۵ میں فرمائی۔ اس مسئلہ پر مزید تفصیل کے لیے سیرۃ النبی جلد چہارم اور رحمۃ للعالمین جلد سوم کی طرف رجوع کریں۔

حکم دیا:-

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوٓا أَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ط

اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے رکھی ہے۔ اس میں سے کچھ خرچ کر دیا کرو۔ اُس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین ہے نہ دوستی اور نہ شفاعت ہے۔

۲/۲۵۴

لیکن مسلمانوں میں اِن احکام کی طرف سے لاپروائی اور غفلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی کا سوز و ساز ختم ہو گیا۔ اس سے شانِ محبوبی رخصت ہوئی اور ان کی تاریخ کے واقعات افسانہ بن کر رہ گئے ؎

ابطحی در دشتِ خویش از راہ رفت
از دم او سوزِ الّا اللہ رفت
مصریاں افتادہ در گردابِ نیل
سست رگ تورانیانِ ژندہ پیل
آلِ عثماں در شکنجِ روزگار
مشرق و مغرب ز خونش لالہ زار
عشق را آئینِ سلمانی نماند
خاکِ ایران ماند و ایرانی نماند

سوز و سازِ زندگی رفت از گلش
آں کہن آتش فسرد اندر دلش
مسلم ہندی شکم را بندۂ
خود فروشے، دل ز دیں برکندۂ
در مسلماں شانِ محبوبی نماند
خالدؓ و فاروقؓ و ایوبیؒ نماند

پیامِ مشرق ۴

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ظاہر و باطن کی خلافت کا سردار بنایا اگر وہ خود اپنے جوہرِ ادراک کو کھوئے اور خس و خاشاک کا غلام ہو جائے تو شکوۂ تقدیر اور اُمیدِ شفاعت بے معنی ہے ۵

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک
کس طرح ہوا کُند ترا نشترِ تحقیق؟
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں

نے گرمیٔ افکار، نہ اندیشۂ بے باک
روشن تو وہ ہوتی ہے جہاں بیں نہیں ہوتی
جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہِ پاک
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری

ارمغان حجاز ۲۴۸-۲۴۷

اقبال ہر مسلمان کے لیے ایسی زندگی کا خواہاں ہے۔ جس کے ہنگامے ختم ہونے پر خود یزداں کو بھی دنیا میں خلا محسوس ہونے لگے ؎

چناں بزی کہ اگر مرگ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

زبورِ عجم ۱۱۹

وہ اُس مسلمان کا خواہاں ہے جو اپنے خالق کی صفت خالقیت کا پرتو رکھتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ۔

زندگی جہد است و استحقاق نیست پیام مشرق ۵

اور اس حقیقت سے باخبر ہو کہ ؎

ضربتے باید کہ جانِ خفتہ برخیزد ز خاک
نالہ کے بے زخمہ از تارِ رباب آید بروں
تاکِ خویش از گریہ ہائے نیم شب سیراب دار
کز درونِ او شعاعِ آفتاب آید بروں

ذرۂ بے مایۂ ترسم کہ ناپیدا شوی
پختہ ترکن خویش را تا آفتاب آید بروں

درگزر از خاکِ وخود را پیکرِ خاکی مگیر
چاک اگر در سینہ ریزی ماہتاب آید بروں

گر بروئے تو حریمِ خویش را در بستہ اند
سر بسنگِ آستان زن لعلِ ناب آید بروں

زبورِ عجم ۱۳۸

یہی وہ زندگی ہے ۔جس نے مسلمانوں کے لیے دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا اور یہی وہ مسلمان ہیں ۔جن کے متعلق مقوقس بادشاہ کے سپاہیوں نے اُس کے اس سوال کے جواب میں کہ تم نے مسلمانوں کو کیسا پایا ۔یہ جواب دیا :۔

" اے بادشاہ! ہم نے ایک ایسی قوم کو دیکھا ۔جو موت کو زندگی سے زیادہ محبوب رکھتی ہے ۔کبر و نخوت سے زیادہ تواضع کو پسند کرتی ہے اس قوم کا کوئی فرد بھی دنیا کو مرغوب نہیں رکھتا اور نہ دنیا سے بے رغبتی انھیں ملول و رنجیدہ رکھتی ہے ۔زمین پر بیٹھ جاتی ہے اور سواریوں پر کھانا اُن کے لیے دشوار نہیں ہے۔اُن کے امیر و غریب اس طرح مساوات سے زندگی بسر کرتے ہیں کہ کوئی چھوٹا بڑا معلوم نہیں ہوتا ۔یہاں تک کہ غلام و آقا میں فرق محسوس نہیں ہوتا ۔جب اُن کا نماز کا وقت آتا ہے تو اُن میں کوئی بھی ایسا باقی نہیں رہتا جو عبادت میں حاضر نہ ہو ۔لوگ

عبادت سے پہلے ہاتھ منہ دھو لیتے ہیں اور نماز انتہائی خشوع وخضوع سے پڑھتے ہیں [1]

یہ سن کر مقوقس نے اپنی قوم سے کہا،

"اگر یہ قوم پہاڑ کو اکھیڑنے کا ارادہ کرے گی تو یقیناً اس میں کامیاب ہوگی۔ دنیا میں کوئی بھی اس قوم سے لڑ کر فتح حاصل نہیں کر سکتا" [2]

شاعر مشرق نے بھی یہی کہا ہے ؎

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

بانگ درا ۳۰۶

---

[1] اسی لیے علامہ اقبال نے فرمایا ؎

مثلِ آبا غرق اندر سجدہ شو — آنچناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو

رموز ۱۵۸

[2] اسلام کا نظام سیاست وعدالت، از یعقوب الرحمٰن عثمانی